اقبال جہاں دوست

پروفیسر عبدالحق

پروفیسر ایمرٹس

شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

اقبال اکیڈمی

نئی دہلی، (انڈیا)

اقبال جہاں دوست

پروفیسر عبدالحق
پروفیسر ایمرٹس
شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

اقبال اکیڈمی (انڈیا) نئی دہلی

جملہ حقوق بحق مصنف

اقبال جہاں دوست : پروفیسر عبدالحق
جنوری : ۲۰۲۴ء
قیمت : چار سو روپے
تعداد : پانچ سو
ناشر : ۲۳۱۵/ ہڈسن لائن کنگزوے کیمپ، دہلی ۱۱۰۰۰۹

IQBAL JAHAN DOST

by **Prof. Abdul Haq**

2315 Hudson Line Kingsway Camp Delhi

110009

Mob:9350461394

Price: Rs. 400

پیکرِ عفت وشرافت

پیاری چچی

زہرہ خاتون

کے نام

مرحومہ نے والدہ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین ودنیا کا سبق تیری حیات

فہرست

معراجِ رسولؐ: فکرِ اقبال کا محرک تخلیق	9
فکرِ اقبال اور نسلِ نو	27
اقبال اور داستان سرائی	48
اقبال زمان و مکان سے ماورا مفکر شاعر	58
اقبال وطن کی عظمت و آزادی کا نغمہ ساز مفکر شاعر	68
اقبال اور امیر مینائی	88
اقبال تہذیبی کثرتوں کا شاعر	95
اقبال تنقید کے تین فرزانے	104
اقبال اور متعلقاتِ اقبال	110
جون پور: اقبال شناسی کی شاہراہ کا سنگِ نشاں	154
ضمیمہ	204
قرآن کریم کے نادر قلمی اوراق	

عرضِ حال

ربِّ کریم کا بڑا احسان ہے کہ نامساعد حالات میں بھی اس ذاتِ پاک نے ہراساں نہ ہونے دیا۔شکوۂ تقدیر وتاخیر کا کوئی جواز نہیں۔اقبال نے سرگرمِ کار رہنے پر اصرار کیا ہے وہ ہرلمحہ نئے عزم پیدا کرنے کی تاکید بھی کرتے ہیں۔ان کا پیغام جاں فروز ہےاور دل کشا بھی۔اقبال کی شاعری جہاں آشوب نغموں کے آہنگ سے معمور ہے۔وہ ارض وسما کے ہنگاموں میں جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔اور فکر وعمل سے نئی دنیا تعمیر کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔کرۂ ارض پر نادانوں کی کج فکری نے نوع انساں کو ہرطرح کے مکروفسوں میں مبتلا کیا ہے۔اس فسوں کو توڑنے کے لیے ربِّ جلیل سے قوت وشوکت کی طلب ضروری ہے۔اس کا حصولِ اقبال کے فکر و پیغام کا مرکزی نقطہ ہے۔علامہ اس فکر سے خالی امامت ونیابت کو برگِ حشیش کہتے ہیں۔یہ قولِ اقبال زندگی ایک مسلسل اور آگے کی طرف رواں دواں عمل کا نام ہے۔کائنات کی ہر شے اسی عمل پر گامزن ہے۔کسی مقام پر ٹھہر جانا ہلاکت کا سبب ہے جو ٹھہرے وہ کچل گئے ہیں ایک لحظہ کی غفلت صدیوں سال کی محرومی کے برابر ہے۔کارواں میں سنگِ نشاں بھی ریگِ رواں کا ہم دوش ہے۔یہی حقیقت ابدی ہے۔جہاں یہ استقامت ہو کامرانی مقدر بن جاتی ہے۔سفر مشکل ہو تو پاؤں کی دھمک سے ہزاروں چشمے پھوٹتے ہیں۔اقبال فہمی کار نیک سہی مگر دل وجاں کے حوصلے کی طلب گار بھی ہوتی ہے۔عزم کی بشاشت سے رگِ سنگ میں لہو کی گردش تیز تر ہوجاتی ہے۔جہانِ تازہ کی تخلیق کا یہی سبب ہے۔فکرِ اقبال کا فیضان ہمارے ہرشمار سے فزوں تر ہے۔ہرشعر جاں فروز وہم نوا محسوس ہوتا ہے۔دھوپ ہو یا چھاؤں وہ رگ جاں کے قریب محسوس

ہوتا ہے۔اور قلبِ سلیم کو ہر رنج وراحت میں شکرِ رب کی توفیق بخشتا ہے۔ یہ شعرِ اقبال کی معجز نمائی ہے کہ وہ جان وتن کو مقاصدِ حیات سے آشنا کرتا ہے۔اسی سے کارزارِ زندگی کا ہر لمحہ فروزاں ہوتا رہتا ہے۔اقبال نے معراج رسولؐ کے مہتم بالشان واقعہ کی نئی فکری تفہیم کی ہے۔نسلِ نو سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر راقم نے کلام اقبال کی مدد سے نئے گوشوں اور امکانی حدود کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اسی طرح اقبال کے حبِّ وطن اور تحریک آزادی کے مجاہدانہ فکر وکردار کی روشن رہ گزر پر گفتگو کی گئی ہے۔ایک طویل نشریہ کو قلم بند کر کے کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔آخری مضمون دیارِ شرق میں علامہ کی مقبولیت کی راز جوئی پر منحصر ہے جس میں ایک ضلع کے حدود کو زیرِ نظر لایا گیا ہے۔جس میں راقم کی زمینی محبت کو علامہ کے فکر وشعر سے نسبت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

راقم نے ضمیمہ میں قرآن کریم کے بہت قدیم اور نایاب چند اوراق کو پیش کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔رحمت رب کی اس ارزانی کے لیے سراپا احسان مند ہوں۔مضامین کے اس مجموعے میں نئے عنوانات کو پیش کرنے کی حقیر کوشش کی گئی ہے۔اقبالیات کے ضخیم ذخیرے میں نئے موضوع کی تلاش ایک کارِگراں ہے۔راقم کا یقین ہے کہ اب بھی بہت سے نئے پہلو توجہ طلب ہیں بہ قول علامہ

ہزار بادۂ ناخوردہ دورگِ تاک است

(خوشہ میں اب بھی ہزاروں بن چکھے انگور موجود ہیں)

پایانِ عمر کی یہ کوشش شاید دوستوں اور عزیزوں کو پسند آئے۔ان کی نیک خواہشات میرے محسنات میں شامل ہیں۔وہ میرے لیے حاصلِ عمرِ رائگاں بھی ہیں خالق کون ومکاں سے مزید توفیق کی آرزو رکھتا ہوں۔

اسی سے ہے مرے نخلِ کہن کی شادابی

عبدالحق

یکم جنوری،۲۰۲۴ء

معراجِ رسولؐ: فکرِ اقبال کا محرکِ تخلیق

بنی نوعِ بشر کی تاریخ کا سب سے مہتم بالشان واقعہ بعثتِ رسالت مآبؐ ہے۔اور بعثتِ رسولؐ کا سب سے عظیم الشان، حیرت فروز معجزہ معراج کا سفر ہے۔ جو لامکاں کے مشاہدات سے معمور تکمیلِ دین کا منشور ہے۔ یہ حضور سرورِ کائناتؐ کا خاص امتیاز ہے جو کسی دوسرے نبی کا نوشتۂ تقدیر نہ بن سکا۔اسی سے اسلام کے ارکان وعقائد کی اساس وادراک میں عالمِ غیب کے مشاہدات کی نور فشانی جلوہ گر ہوئی ہے۔سفرِ معراج نزولِ نبوت کا حکیمانہ حادثہ اور سلسلۂ رسالت کے اختتام کا اعلانیہ ہے۔دوسری طرف یہ ہمارے علم وعرفان کے لیے غیر معمولی موضوعِ سخن بھی ہے۔شاید ہی کسی دوسرے موضوع پر اتنا ضخیم سرمایۂ کلام موجود ہو سیکڑوں معراج نامے منظوم کیے گئے یہ مقدس محفلوں میں جذبۂ شوق کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ یہ ہماری فکری اور دینی ثقافت کا فروزاں عنوان بنا۔ اقبال کی دنیائے فکر میں معراجِ رسولؐ سرچشمۂ نور بن کر روشن ہوا۔اسی کے پرتوِ جمال نے فکر اقبال کو تازگی اور طرب ناکی کی ارزرانی بخشی ہے۔سفرِ معراج کی سایہ نشینی شعرِ اقبال میں جابجا نظر آتی ہے۔اسباب دعوتِ نظر کا مطالبہ کرتے ہیں۔اس مطالبے میں فکر ونظر کے ساتھ عرفان وآگہی کی پاکیزگی بھی شامل ہے۔

اقبال کی فکر وتخلیق کے دو بہت ہی خاص اور اہم مصدر ہیں۔کتاب اور صاحبِ کتاب ہی ان کے تلاطمِ افکار کا منبہ ومخرج ہیں۔صحفِ سماوی کی آخری تنزیل قرآنِ کریم

اور سلسلۂ ہدایت کے لیے آخری رسولؐ فکرِ اقبال میں روحِ رواں کی طرح سرگرم کار ہیں۔ اقبال نے صدقِ دل سے رموزِ بے خودی میں اعتراف کیا ہے ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لازوال است وقدیم
نسخۂ اسرارِ تکوین حیات بے ثبات از قوتش گیرد حیات
گردر اسرارِ قراں سفتہ ام با مسلماناں اگر حق گفتہ ام [۱]

اسرارِ قراں کے موتیوں سے افکار کو مزین کرنے کا اظہار بہت ہی معنی خیز ہے۔ جسے مطالعۂ اقبال میں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس اقرار میں بالِ جبریل کی غزل کا یہ شعر بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے ؎

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر [۲]

صاحبِ کتاب کے بارے میں اقبال نے ایک آخری بات کہہ دی ہے پس چہ باید کا یہ شعر مطالعۂ اقبال میں حقیقتِ ابدی کی طرح ایک بڑے انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست [۳]

یعنی یہ سب کچھ تیرے بے حساب لطف وکرم کی بدولت ہے تیرے احسان وعنایت نے میرے افکار کی پرورش کی ہے۔ یہ دونوں اقرار اس قطعیت کے ساتھ کلامِ اقبال میں دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔ فکرِ اقبال کے سرچشموں کی بازیافت میں یہ نکات قندیلِ رہبانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معراجِ رسولؐ کی تفصیل انہیں دو نکات پر منحصر ہے۔ اس گفتگو میں قرآن کریم کی آیات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ فکرِ اقبال میں ان آیات کے حکیمانہ اظہار کی نشان دہی کے ساتھ ان کے مؤثرات پیشِ نگاہ ہیں۔ قران کریم کرۂ ارض پر نازل ہونے والی آخری مقدس اور دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی مبارک کتاب ہے۔ اس نے انسانی فکر اور معاشرتی نظام کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ دانش وبینائی اور دین

وایمان کی تمام نسبتیں اسی سے منسوب ہیں۔فکر ونظر کی راہیں بھی اسی سر چشمۂ فیض سے پھوٹتی ہیں۔یہی کتاب مسلم ثقافت کا منہاج ومصدر بھی ہے۔

قرآن کریم کے حکیمانہ حوالوں سے اقبال کے فلسفہ وفکر کے نکات گہری بصیرتوں کے حامل ہوئے ہیں۔ یہ حوالے مختلف نوعیت اور صورتوں سے پُر نور ہیں۔کہیں پوری آیت کریمہ پیش ہے۔جیسے

ہر زماں پیشِ نظر''**لاتخلف المیعاد** دار۴؎

ٹل نہیں سکتا''**وقد کنتم تستعجلون**''۵؎

اشہد ان لا الہ اشہدو ان لاالہ ۶؎

کہیں آیت کریمہ کے ٹکڑے منظوم کیے گئے ہیں شعری ضرورتوں کی وجہ سے بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔صرف دولفظوں سے استفادہ کیا گیا ہے،جیسے **لاتخف** ، **لاتحزنون** ، **لاتفسدو** ، **لاتقنطوا** ، **کن فیکون** ، **مازاغ** ، **قاب قوسین** ۔لیکن بیشتر مقامات پر صرف ایک لفظ سے پوری آیت کے اشارات منظوم کیے گئے ہیں۔

حاملِ خلق عظیم، صاحب صدق ویقیں

آیۂ تسخیر اندر شانِ کیست

ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سورۂ رحمٰن کی آیت **کل یوم ھو فی شان** کی طرف اشارہ ہے۔یہ صورت عام ہے۔اکثر اشارات بدون حوالہ ہیں۔آیات کے ترجمہ پر تکیہ کیا گیا ہے۔

کیا ہے تونے متاعِ غرور کا سودا

(ضربِ کلیم۔لاالہ الااللہ)

سورۂ آلِ عمران کی آیت '**وماالحیٰوۃ الدنیا الا متاع الغرور**' سے ماخوذ ہے۔ لفظیات سے شاعری کا الہامی منظرنامہ منور ہوتا ہے۔ اکثر اشارات بدونِ حوالہ میں شعر میں کم وبیش ترجمہ کی صورت نظر آتی ہے۔

ہائے کیا اچھا کہا ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں

آیت:**ظلوماً جھولًا** کی طرف اشارہ ہے

ہر شے مسافر ہر چیز راہی

کل من علیھا فان (سورۂ رحمٰن) کا ترجمہ محسوس ہوتا ہے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں

انا سخرنالکم مافی السمٰوات والارض کی طرف واضح اشارہ ہے جس سے کلام اقبال فروزاں ہے ۔ یہاں قرآنی لفظیات کے حوالے نہیں دیئے گئے ہیں۔معراجِ رسولؐ کے ذکر میں کلام اقبال میں کم وبیش ایسے ہی قرآنی اشارات موجود ہیں ۔جنہیں تکرار کے ساتھ منظوم کیا گیا ہے ۔معراج کی قدرے تفصیل سورۂ والنجم کے پہلے رکوع میں ملتی ہے۔اس سورۃ کی طرف اشارے ملاحظہ ہوں۔ضربِ کلیم میں نظم کے آخری شعر کا اشارہ بہت ہی فکر انگیز ہے۔

تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا

ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج

یہی اشارہ جاوید نامہ میں حلیم پاشا کے حوالے سے رقم کیا گیا ہے۔

قرأتِ آں پیر مردے سخت کوش

سورۂ والنجم داں دشتِ خموش

معراجِ رسولؐ کے تذکرے میں سورۂ والنجم کی آیت **مازاغ البصر وما طغیٰ** کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔اس آیت کریمہ کی تشریح وتعبیر میں مسلم ادبیات میں ایک بہت وقیع ذخیرۂ تحریر موجود ہے۔اس آیت کریمہ کی راز جوئی اور اسرار کشائی میں پورے واقعہ کی روح جلوہ نما ہے۔یہ حضور رسالتِ مآبؐ کے سفر کا نقطۂ عروج ہے یہی انتہائے کمال اور علوئے بشریت کی انتہا بھی ہے۔اقبال نے اسی آیت سے فکری استفادے کی قندیل روشن کی ہے۔ان کے تصورِ معراج کے ادراک کی تمام نور فشانی اسی نقطے پر مرتکز ہے۔

رموزِ بیخودی میں پہلی بار اس آیت سے اقبال نے اپنی اجتہادی فکر کو آراستہ کیا ہے۔

آں نگاہش سرِّ مازاغ البصر
سوئے قومِ خویش باز آید دگر

معراج کے اس پہلو کی باز آفرینی کو ان کے فکری اجتہاد سے منسوب کیا جانا چاہیے۔اس نکتہ کا حاصل ہے کہ معراج شہِ لولاکؐ کے لیے عالمِ غیب کے روحانی مشاہدات کا وسیلہ ہے جس سے وہ سرشار ہوئے اور روئے زمین پر واپس آ کر بہت قلیل مدت میں ایک عظیم الشان اور مثالی معاشرہ کی تربیت کی۔اس فکری مقدمے کو اقبال نے تشکیل جدید کے چوتھے خطبہ میں دوسری بار بڑی صراحت نے بیان کیا ہے وہ اسے تکمیلِ دین اور انسانِ کامل کی سربلندی کا صلائے عام سمجھتے ہیں اقبال نے اسے نکتۂ معراج کا اسرارِ سفر اور رازِ نہاں تسلیم کیا ہے۔اس خیال کی تائید میں اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ رسولِ اکرمؐ لامکاں کے مشاہدات و محصولات کو سینے میں سمیٹے ہوئے واپس آئے۔

چناں باز آمدن از لامکانش
درونِ سینہ او درکف جہانش

ذاتِ اقدسؐ کے سینے میں کائنات کے مشاہدات کا گراں مایہ سرمایہ محفوظ ہوا۔ جاوید نامہ میں فلک زہرہ پر تیسری بار اسی آیت کا ذکر ملتا ہے۔

مازاغ البصر گیرد نصیب
برمقامِ عبدہٗ گردد رقیب ؎

اقبال نے چوتھی بار ’ضربِ کلیم‘ میں دعائیہ کلمات کے طور پر اسے رقم کیا ہے

فروغِ مغزبیاں خیرہ کررہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ ؎8

رموز بیخودی میں پانچویں بار اس آیت کا اعادہ کیا گیا ہے:

اُمیّے پاک از ھوی گفتارِ او
شرح رمزِ ماغویٰ گفتار او

قرآن کریم کے سورۂ بنی اسرائیل میں معراج کا ذکر بہت مختصر ہے۔صرف ایک

آیت سے اس کی عظمت کا اظہار ہوا ہے۔ اقبال نے لفظ اسرا کئی جگہ استعمال کیا ہے اور اس کی گہری معنویت پر اشارے کیے ہیں۔ ایک شعر میں قرآن کریم کی تلمیحات بیان کی گئی ہیں۔ آدم کو علوم کا سکھانا اور محمدؐ کا سفرِ معراج دونوں حضورِ حق کی جلوہ گاہ کے رازِ نہاں ہیں۔

مدعائے علم الاسما ستے
سرِ سبحان الذی اسراستے [9]

مثنوی مسافر میں بھی اسی آیت کریم کا اشارہ موجود ہے۔

آشکارا دیدنش اسرائے ماست
در ضمیرش مسجد اقصائے ماست [10]

فکرِ اقبال میں سفرِ معراج کو بڑی معنویت حاصل ہے۔ انہوں نے جاوید نامہ میں مردِ مسلماں کے لیے اسے سنتِ رسالت مآبؐ قرار دیا ہے۔

سنتِ او سرّ ے از اسرار او ست

اس سورہ کی دوسری آیت بھی فکر انگیز اور ہمارے دینی و روحانی مباحث میں سرِ عنوان شمار ہوتی ہے۔ نبیؐ کا قربِ الٰہی اور اس کی پُر اسرار نوعیت پر تفسیر و احادیث میں بڑی دل کشا صورتیں موجود ہیں۔ سیرتِ رسولؐ کے ذکر و فکر میں قاب قوسین سب سے لطیف اور سب سے زیادہ حیرت افروز منظر ہے۔ اقبال نے مولائے کائنات کے اس مخصوص اور منفرد امتیاز کو جگہ جگہ منظوم کیا ہے۔ ابتدائی اور متروک نظم 'فریادِ امت' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

قاب قوسین بھی دعویٰ بھی عبودیت کا کبھی چلمن کو اٹھانا کبھی پنہاں ہونا
ماعرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری قاب قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

اسی دور کی متروک نظم 'نالۂ یتیم' میں سورہ والنجم کی مذکورہ آیت کا دوسرا ٹکڑا بھی تلمیح میں شامل ہے۔

طور پر چشمِ کلیم اللہ کا تارا ہے تو
معنیٔ یٰسین ہے تو مفہوم او ادنیٰ ہے تو

'یٰسین' کی تلمیح کو بالِ جبریل کی غزل میں دہرایا گیا ہے۔

وہی فرقان ، وہی قراں ،وہی یٰسیں ، وہی طاہا

معراج کے تعلق سے سورہ والنجم کو بڑی فضیلت حاصل ہے ۔اس کی آیاتِ کو اقبال نے کثرت سے اپنی فکری اساس کا عنصر بنایا ہے۔سفرِ معراج کے واقعہ نے اقبال کی فکر ونظر کو تحریک وتلاطم کی بے پایاں قوت بخشی ہے۔ان کی دنیائے فکر کا سب سے روشن باب اور شناخت کا امتیازی سبب سعیٔ پیہم کا انقلابی سبق ہے۔یہی ان کا حاصلِ فکر ہے جس کا مصدر قرآن کریم ہے جس میں غوطہ زن ہونے کی تاکیدی ہے۔اوراس کے بغیر زندگی محال ہے۔

نیست ممکن جز بقرآن زیستن

قرآن پر عمل پیرا ہونے کی حکیمانہ تاکید ان کے بنیادی فکری اسلوب کا نشانِ امتیاز ہے۔انہوں نے اسی کو زندگی کا میدان قرار دیا ہے۔جوانسان گرمیٔ قراں کی حرارت سے محروم ہے اس سے خیر کی امید رکھنا فضول ہے۔

سینہ ہا از گرمیٔ قراں تہی
از چنیں مرداں چرا امید ِ بہی

(جاوید نامہ)

اس سرچشمۂ فکر میں معراجِ رسولؐ کے واقعہ نے اقبال کے فلسفہ وفکر کو سرگرم عمل رہنے کا جو حوصلہ بخشا ہے ۔اس کی نظیر نہیں ملتی ۔اس سفر کے لذتِ پرواز نے اقبال کو پرجوش کیا ہے۔مسلم ادبیات میں غالباً اقبال کی پہلی مثال ہے جنہوں نے معراجِ رسولؐ سے متاثر ہوکر ایک عظیم الشان شعری تخلیق کو منظوم کیا۔جاوید نامہ میں سات آسمانوں کے سفر کی روداد قلم بند کی گئی ہے ۔معلوم نہیں کیسے پروفیسر عبدالستار دلوی سے سات کی جگہ نو آسمانوں کے سیر کی غلطی ان کی کتاب اقبال اور بھرتہری میں داخل ہوگئی ۔اس کتاب میں

دوسرے گمراہ کن متن بھی شامل ہیں۔جن سے اقبال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔قرآن سے لے کر ادب تک ہر جگہ سات آسمانوں کا ذکر ہوا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں

یہ سفر فکر و عرفاں کے گہرے مسائل اور مباحث پر مشتمل ہے۔ یہ شعری مجموعہ ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ اقبال کی تفکیر دینی کے امتیازات کو روشن کرنے کا سبب بنا۔ اتنے فکری مباحث کسی اور تخلیق میں نظر نہیں آتے۔ مطالعۂ اقبال میں یہ ناگزیر تخلیق ہے۔اسے صرف نظر کر کے اقبال کی تفہیم ممکن نہیں ہے۔فکر و شعر کے حیرت انگیز امتزاج کا یہ ایک حیرت خیز نمونہ ہے۔جس کی مثال نہ ماضی میں موجود ہے۔اور نہ حال میں حاصل ہو سکی۔اس بے مثال تخلیق کا محرک و مصدر معراج رسولؐ ہے۔ یہ تخلیق معراج کے فیضان کا نتیجۂ فکر ہے تو دوسری طرف اس مبارک سفر کی اہمیت و غایت کو سمجھنے کے لیے ایک نیا فکری زاویہ نظر بھی ہے۔ یہ ایک بڑے مفکر شاعر کا تخلیقی اعجاز بھی ہے۔شعری تخلیق کے علاوہ اقبال نے اپنی ڈائری StrayReflections میں اور خطبات میں بھی معراج کے حیرت انگیز حوالے دیے ہیں۔

'تشکیل جدید' کے چوتھے اور پانچویں خطبے کی ابتدا کی عبارت بہت ہی فکر انگیز ہے۔ڈائری کا یہ جملہ بھی کم اہم نہیں ہے۔اقبال نے اپنے تصورِ خودی کو معراج رسولؐ سے نسبت دے کر ایک اجتہادی فکری نکتے کو پیش کر دیا ہے۔

"The Idea of Meraj in Islam is to face vision of reality without the slightest displacement of your own ego"

''اسلام میں معراج کا تصور اپنی خودی کا ایک لمحے کے لیے خیرگی کے بغیر حقیقتِ مطلق کا روبرو مشاہدہ ہے۔''

گویا معراج کا مشاہدہ فلسفۂ خودی کے وجود کی دلیل ہے۔اس لیے بھی اقبال کو

اس سفر اور مسافر دونوں سے گہری فکری نسبت ہے۔ جس کے طفیل تخلیق کا شاہ کار وجود میں آیا۔ واقعۂ معراج کی معجز نمائی ہے کہ اقبال کے قلب ونظر میں اس کے مؤثرات تخلیق کے خونِ گرم میں تبدیل ہوئے مسلم ادبیات میں کسی ذی فکر تخلیق کار نے اس عظیم الشان سفر کے متعلقات پر ایسی گہری گفتگو نہیں کی۔ حکمت ودانائی سے معمور جاوید نامہ کی تخلیق معراجِ رسولؐ کے تاثرات کی مظہر ہے۔ جاوید نامہ عہد حاضر کے عظیم فن کار کا سفرِ معراج ہے۔ جو بیداری اور بشری بدن کے حواس وادراک کے ساتھ ہے۔ اقبال کے تمام شعری مجموعوں میں جاوید نامہ کو خاص امتیاز حاصل ہے کہ وہ ایمان ویقین کے ایک عظیم الشان واقعہ کے فیضان کا حاصل ہے۔ اتنے متنوع اور گہرے افکار سے معمور ان کا کوئی دوسرا مجموعہ نہیں ہے۔ ہونا بھی چاہیے تھا کیوں کہ اس کی نسبت کائنات کی سب سے برگزیدہ شخصیت سے ہے جو بہ ظاہر بشری مشتِ خاک میں نظر آتا ہے مگر حقیقت میں پیکرِ نور ہے۔ اور جسے انوار کے جلوہ ہائے نوع بنوع نے گھیر رکھا ہے۔ اس حقیقت کے بعد خواب وبیداری کی بحث اقبال کے نزدیک بے معنی ہے۔ اقبال نے اپنے مردِ کامل کی شبیہ سازی کی ہے۔ وہ خاکی ونوری نہاد اور بندۂ مولا صفات کا مجموعہ ہے۔ اقبال نے معراجِ نبویؐ سے استدلال کیا ہے کہ انسان کامل کی اکمل ترین ذات حضور رسالتِ مآبؐ کی ہے۔ کیوں کہ جلوۂ ربّانی کے روبرو ومشاہدات میں ایک لمحہ کے لیے بھی نگاہوں میں خیرگی نہ ہوسکی۔ تابِ نظر ذاتِ رسولؐ کی تکمیلیت کی تمثیل ہے۔ ذاتِ رسولؐ ہی انوارِ الٰہی کے تب وتاب کی متحمل ہوسکتی ہے۔ اقبال نے رموز بیخودی کے آخری حصہ 'عرض حال مصنف بحضور رحمت للعالمینؐ' میں اقرار کیا ہے۔

شش جہت روشن ز تابِ روئے تو

اس عنوان کا پہلا مصرع ہے

اے ظہور تو شبابِ زندگی

لفظ ظہور غور طلب ہے۔ کیوں کہ یہی لفظ اپنی تمام تر معنوی وسعتوں کے ساتھ بال جبریل کی مشہور تخلیق ''ذوق وشوق'' میں رسالتِ مآبؐ سے متعلق مشہور بند میں بھی

مستعمل ہے۔

عالمِ آب وخاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ تو دیا تو نے طلوعِ آفتاب [۱۱]

تجھے دیکھنے کے بعد سراپا نور بن جانا فیضانِ الٰہی کی نگاہِ ناز کا ادنیٰ کرشمہ ہے ۔پیامِ مشرق میں ہے:

سراپا نورم از نظارۂ تو

معراج کی عظمت وبرکت کے بارے میں اقبال نے جابجا اظہار کیا ہے ۔ بانگِ درا کے حصۂ سوم میں ایک مختصر نظم ہے ۔معراج کی حقیقت اقبال پر منکشف ہوچکی ہے ۔اور یہ خیال فکر کو مہمیز کرتا ہے ۔اس خیال کی درخشانی تقریباً ہر جگہ نظر آتی ہے ۔اس شعر پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے سفرِ معراج کو رہ یک گام کہنا فکرِ اقبال کا بنیادی نکتہ ہے۔

کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات
رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں [۱۲]

اس کے بعد جاوید نامہ میں معراج کا کئی بار تذکرہ ہے ۔جو اقبال کی دینی فکر اور اجتہادی نظر کی وسعتوں اور انتہاؤں کی غمازی کرتے ہیں ۔معراج نے ہی جاوید نامہ جیسی عظیم الشان شعری تخلیق کو متحرک کیا ہے اس واقعہ اسرا کے رموز کو جدید فکری تناظر میں دیکھنے کی دعوتِ فکر ونظر بھی ہے ۔یہ نکتہ ملاحظہ ہو:

چیست معراج آرزوئے شاہدے
امتحانے روبروئے شاہدے [۱۳]

دوسرا بیان بھی ملاحظہ ہو۔

از شعور است ایں کہ گوئی نزد ودور
چیست معراج انقلاب اندر شعور [۱۴]

خالق تک رسائی اور اس کے روبرو فکر وعمل کے احتساب کی آزمایش ہی معراج

کا اصل مفہوم ہے۔ جہاں سے بھی دیکھیے فکر وشعور میں اضطراب وانقلاب برپا کر دینے کا نام ہی معراج ہے۔ گویا ذوقِ پرواز اور شعور میں انقلاب آفرینی سفرِ معراج کی مرہونِ نظر ہے۔ عزم وہمت ہو تو بالائے آسماں سے بھی پرے پرواز اور پہنچنے میں ایک جست کی ضرورت ہے۔ پس چہ باید کرد میں تیسری بار اقبال نے مشہور حدیثِ نبویؐ کی اپنی فکر وآگہی سے ایک نئی تعبیر پیش کی ہے۔

در بدن داری اگر سوزِ حیات
ہست معراجِ مسلماں در صلوٰۃ

ہر نماز میں بندہ مالک کے روبرو ہو کر ربِّ جلیل کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ بھی بندہ کو اپنی نگہِ کرم نواز سے دیکھتا ہے۔ یہ دوسرا قولِ رسولؐ بھی اقبال کے پیش نظر ہے۔ علامہ کا اصرار ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب نمازی کے جسم وجاں میں جینے کی تڑپ اور تپش کا اضطراب ولولہ انگیزی برپا کیے ہو۔ لفظ معراج کو چوتھی بار بالِ جبریل کی غزل میں استعمال کیا گیا اور اس حقیقت کا ادراک کرایا ہے کہ بحر وبر ہی نہیں آسمان کے سورج چاند اور چمکتے تارے بھی بنی نوع انسان کی زد میں ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں [۱۵]

اس سے قبل ۱۹۲۳ء میں ہی طلوع اسلام میں اقبال نے چرخِ نیلی نام سے بھی آگے مسلمان کی منزل بتائی ہے۔

پرے ہے چرخِ نیلی نام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے [۱۶]

یہ تصورات تخیلی یا مثالی نہیں ہیں۔ اقبال کی دلیل ہے کہ مالک کون ومکاں کے محکم ارشادات ہیں جس میں تسخیر کائنات کی بشارت ہی نہیں۔ عہد وپیمان کا اقرار نامہ بھی موجود ہے۔ آیۂ تسخیر کو اقبال نے بار بار یاد دلایا ہے۔

آیۂ تسخیر اندر شانِ کیست ایں سپہرِ نیلگوں حیران کیست ۱۷

'ضربِ کلیم' میں پانچویں بار اقبال نے معراج عنوان کی مختصر نظم میں معراج رسولؐ کی روح کو اپنے فکری نظام و پیغام کا حاصل قرار دیا ہے۔ ولولۂ شوق اگر پیدا ہوجائے تو بندۂ خاکی اپنی لذتِ پرواز سے چاند اور سورج کو بھی اپنی گرفت میں لاسکتا ہے۔ معراجِ نبوی مخصوص امتیاز اور سیرت سرورِ عالمؐ کا سب سے عظیم معجزہ ہے۔ یہ سرِّ سرا یعنی رازِ دوعالم کی تسخیر کا نسخۂ نبوت ہے۔ نظم کا پیغام اور لفظیات کے معنوی متعلقات توجہ طلب ہیں۔ یہی پیغامِ سفر پوری شاعری اور فکر میں رودِرواں بن کر جاری ہے۔ جس کے مختلف نام اور متنوع اشارات ہیں۔

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کرسکتا ہے وہ ذرہ مہ ومہر کو تاراج ۱۸

ایک جگہ کہا ہے کہ زندگی کا حاصل لذتِ پرواز ہے۔

زندگی جز لذتِ پرواز نیست

اس شعر میں نکتۂ معراج کی روح جلوہ فشاں ہے۔ ولولۂ شوق اور لذتِ پرواز سے اقبال کو خاص لگاؤ ہے۔ کلام میں کئی بار تکرار کے ساتھ ان لفظوں کا استعمال ہوا ہے۔ اردو و فارسی شاعری میں ولولہ اور پرواز کا کثرتِ استعمال فکر اقبال کے نہاں خانۂ راز میں بڑی معنویت کا حامل ہے۔ جیسے

اک ولولۂ شوق دیا میں نے دلوں کو ۱۹
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا ۲۰
دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے ۲۱

لفظ پرواز فکر اقبال کا بہت محبوب اور معنی خیز استعارہ ہے جو کثرت سے کلام میں ملتا ہے۔ یہی پرواز مسلسل جدوجہد کے آداب سکھاتا ہے اور سعیٔ پیہم کو جنوں خیز کرتا ہے۔

زندہ تر گردد ز پروازِ مدام
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
جہاں میں لذت پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذب خاک سے آزاد

(بالِ جبریل)

درجنوں اشعار اسی استعارے کی بدولت زندگی کی تابانی کے مضمرات سے روشن ہیں اقبال نے بڑی قطعیت کے ساتھ اس نکتے کو پیش کیا ہے کہ اگر جذب وشوق ہو تو مٹی کا یہ بدن پرواز میں حائل نہیں ہوسکتا۔ یہ خاکی جسم صرف مٹی کا ڈھیر نہیں ہے۔ معراج نبیؐ اس پر واضح دلیل اور مشعلِ راہ ہے۔

ایں بدن ماجانِ ما انبار نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست۲۲

اسی ضمن میں معراج سے متعلق یہ قول بھی ملاحظہ ہو۔

خاک را پرواز بے طیارداد

فرزند آدم بہ ظاہر مشت خاک نظر آتا ہے۔ مگر اس کی سرشت میں افلاکی صفات بھی ہیں۔ اقبال کا یہ شعر پیشِ نظر رکھیے۔

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی

معراج کے تعلق سے سیر افلاک کے منظر نامے کو پیشِ نگاہ رکھیے اور کلام کو دیکھیے تو اس سے نسبت رکھنے والے ذخیرۂ الفاظ فکرِ اقبال کے موثرات کی غمازی کرتے ہیں ۔ان کے فکر کی دنیا میں اس واقعہ نے ایک انقلاب برپا کیا ہے۔ فلک، عالمِ افلاک سیر افلاک، فلک الافلاک، مکاں لامکاں، کہکشاں، آسماں، انجم، مہ ومہر، نیلگوں افلاک،

بندۂ آفاق، صاحبِ آفاق، ستاروں سے آگے، پرے ہے چرخ نیلی فام گم اس میں ہے آفاق۔اقبال کی نگاہ میں آب وخاک کچھ حقیقت نہیں رکھتے انسان کی ماہیت اس سے آزاداور مادے سے ماورا ہے۔اس میں پوشیدہ روح کی ہی جلوہ نمائی ہے جولافانی ہےاور لازماں بھی۔

آدمے از آب وگل بالاترے

یہی روح تڑپنے پھڑکنے کی توفیق بخشتی ہےاور پرواز مدام کےاضطراب سے جسم وجاں کوگرم جوش رکھتی ہے۔ بود ونمود کی کشاکش پیہم سے جوہرِ زندگی آشکار ہوتا رہتا ہے۔اقبال کے پیغام پرتوجہ درکار ہے۔یہ پیغام اسی انقلاب کی دعوتِ عام ہے جسےاقبال نےمعراج کوشعوری انقلاب سےتعبیر کیا ہے

چیست معراج انقلاب اندر شعور

اس شعور کی بیداری سے ہی بیداریٔ کائنات کا عرفان ہوتا ہے یہی بیداری لامکاں وبرمکاں پرکمندیں ڈالتا ہے۔اوراپنے شعلے سے جہانِ مکافات کوزیروزبر بھی کرتا ہے۔گلشنِ رازجدید کا یہ فکرانگیز شعرہماری حیرت فروزی میں اضافہ کرتا ہے۔

چو آتشِ خویش را اندر جہاں زن
شبیخوں برمکاں ولامکاں زن ۲۳

اپنے وجود کی آگ سے لامکاں پرشب خوں مارنے یعنی رسائی اور بازیابی کا حوصلہ معراجِ رسولؐ کے طفیل ہے۔اقبال اسی ولولے کومردِ مسلماں کے قلب ونظر میں جاگزیں کرنا چاہتے ہیں۔زمان ومکاں کے قیدوبند میں اسیر ہوجانے کواقبال ناپسند کرتے ہیں۔کیوں کہ معراجِ رسولؐ نے ان حدود کوعبور کرکے ایک مثال قائم کی ہے۔رسولِ مقبولؐ کے سفر میں زمانہ ٹھہر گیا۔مکاں کی تمام وسعتیں منجمد ہوگئیں۔اورآپ نورِ ربّی کے روبرو ہوئے۔بنی نوع بشر کے لیے بھی یہی منہاج ہےاورمنشائے سیرتِ پیغمبر خاتمؐ بھی۔

تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

فضا تری مہ وپرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں ۲۴

معراجِ رسولؐ عروجِ آدم خاکی کی سب سے روشن دلیل ہے۔اورانسان کے منصب ومقام کی راہِ سلسبیل بھی۔کہکشاں،تارے، نیلگوں افلاک عروج آدم خاکی کے منتظراوراستقبال کے لیے فرشِ راہ ہیں۔اقبال نے بالِ جبریل کی غزل میں اس حرفِ راز کونفس جبرئیل کے حوالے سے بتایا ہے کہ جذبِ مسلمانی سرفلک الافلاک کی پنہائیوں کو اپنے وجود کے اندر مرتکز کر لیتا ہے۔

اک شرعِ مسلمانی اک جذبِ مسلمانی
ہے جذبِ مسلمانی سرِ فلک الافلاک ۲۵

معراجِ رسولؐ کے سلسلے میں یہی سب سے اہم اور فکر انگیز نکتہ ہے جس پر علماواکابرین نے عقل وخرد کی گتھیاں سلجھانے میں دانش وبینش کا بڑا سرمایۂ ادب تخلیق کیا ہے۔اقبال کا اجتہادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ذات گرامیؐ کے وجود میں کائنات کی تمام وسعتیں اور پنہائیاں جذب ہوگئیں۔نہ زماں رہا نہ مکاں۔صرف بندہ رہا اور بندہ نواز۔وقت ٹھہر گیا مکاں سمٹ گیا۔بندۂ مومن کی یہی شان وشناخت ہےاور یہی اس کے وجود کا ہدف بھی ہے۔اسی کو مذکورہ اشعار میں پیش کیا ہے مزید صراحت کے لیےان کے مشہور شعر پر بار دگر غور کرنے کی ضرورت ہے۔اقبال انسان کوصاحبِ آفاق بننے کی آرزو رکھتے ہیں۔

اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندہ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق ۲۶

مومن کے قلب وجگر میں خود آفاق گم ہوتا ہےاور غیر مومن کی پہچان ہے کہ وہ زمین وآسماں کے درمیان اپنے وجود سے محروم نظر آتا ہے۔یہ شعر محاورہ ہی نہیں انسانوں کی پرکھ کا ابدی میزان ہے

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق ۲۷

ان آسان لفظوں میں فلسفہ وفکر کی گہرائی دل ونظر کو مسحور کرتی ہے اور آدم خاکی کے مقام کو بار بار سمجھنے کے لیے ضرب لگاتی ہے۔ اقبال بے سوادی اور کم نگاہی پر ماتم بھی کرتے ہیں وہ انسان کو بخشی گئی تسخیر کائنات کی بشارت سناتے ہیں کیوں کہ اس میں زمین وآسمان کو بدل دینے کی قوت ایک حقیقت ہے۔ جس فطرت نے بڑی فیاضی سے سپرد کی ہے۔ ارض وسما کا اس کے وجود میں گم ہونے یا سمٹ جانے کا فیصلہ بھی فضلِ ربّی ہے۔ اقبال ان کمالات سے متصف ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ انسان کائنات کے سربستہ راز کو افشا کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ زمان ومکاں کی تسخیر بھی اس کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ جاوید نامہ کے آغاز میں تمہیدِ زمینی کے ذیل میں لکھا ہے

باش تاعریاں شود ایں کائنات　　شوید از دامانِ خود گردِ جہات
برمکاں وبرزماں اسوار شو　　فارغ از پیچاک ایں زنار شو[۲۸]

اسی سلسلے میں یہ شعر معنیٰ خیز ہے کہ کائنات کو بے حجاب کیا جائے کہ کوئی پردہ حائل نہ ہوتا کہ انکشافات کے لیے کوئی رکاوٹ مانع نہ رہے۔ اسی طرح اقبال نے اپنے وجود کو بھی بے پردہ دیکھنے کی تلقین کی ہے۔ اس بے حجابی کا سلسلہ بھی ذاتِ حق اور ذات رسالت مآبؐ کے درمیان مازاغ البصر کا اشارہ ہے۔ اپنے وجود کی آگہی کے لیے بھی ضروری ہے۔

برمقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است [۲۹]

اسی کو معراجِ رسولؐ کے تعلق سے انقلاب اندر شعور کہا گیا ہے۔ وجود کے احساس کا انقلابی شعور ہی مکاں ولامکاں سے بھی پرے پرواز کے لیے مائل اور مجبور کرتا ہے۔ اپنی ذات وصفات کا عرفان ہی اقبال کے فکر وفلسفہ کی روح ہے۔ جسے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی سربلندی عین ذات کے مشاہدات سے سرشار کرتی ہے۔ معراجِ رسولؐ سے ماخوذ اقبال کا یہ حکیمانہ اشارہ فکر ونظر کی راہوں کو روشن کرتا ہے۔ اس سے قبل معراج کو سنّتِ رسولؐ کہہ کر اقبال نے ایک بلیغ نکتے کا انکشاف کیا ہے۔ ربِّ عالم نے

اطاعتِ رسولؐ کو صاحبِ ایماں کے لیے لازمی قرار دیا ہے اطاعت واتباع میں روح و بدن کی قید نہیں روح کی پاکیزگی اور قلب ونظر کا اضطراب بھی شامل ہے۔ ذات گرامیؐ کی ہر ہر ادا کی تقلید اور دل وجاں سے تسلیم کرنا ہی دونوں جہاں کی فلاح ونصرت کی دلیل ہے۔ اقبال کا خیال افروز اور عارفانہ اظہار بڑی بلیغ معنویت کا حامل ہے

عاشقی محکم شود از تقلیدِ یار
تا کمندِ تو شود یزداں شکار [۳۰]

حضورِ حق کے ساتھ اپنے وجود یعنی خودی کا عرفان، لذتِ پرواز کا ولولۂ شوق، سعیٔ پیہم، تسخیر کائنات کا سوزِ دروں، زمان ومکاں کے قید وبند سے آزادی، جلوۂ صفات کے مشاہدات سے مثالی معاشرے کی تشکیل وتربیت فکر اقبال کا ہفت پہلو آئینۂ جہاں ساز ہے۔ اوران سب کا قبلہ نما رسولِ عربیؐ کا سفرِ معراج ہے۔

حوالے

۱۔ رموز بیخودی
۲۔ بال جبریل
۳۔ پس چہ باید کرد
۴۔ بانگِ درا
۵۔ بانگِ درا
۶۔ بالِ جبریل
۷۔ جاوید نامہ
۸۔ ضربِ کلیم
۹۔ اسرار خودی
۱۰۔ مثنوی مسافر
۱۱۔ بال جبریل
۱۲۔ بانگِ درا
۱۳۔ جاوید نامہ
۱۴۔ جاوید نامہ
۱۵۔ بالِ جبریل
۱۶۔ بانگ درا
۱۷۔ جاوید نامہ
۱۸۔ ضربِ کلیم
۱۹۔ بال جبریل
۲۰۔ ضربِ کلیم
۲۱۔ بال جبریل
۲۲۔ جاوید نامہ
۲۳۔ جاوید نامہ
۲۴۔ بالِ جبریل
۲۵۔ بال جبریل
۲۶۔ ضربِ کلیم
۲۷۔ ضربِ کلیم
۲۸۔ جاوید نامہ
۲۹۔ جاوید نامہ
۳۰۔ اسرارِ خودی

فکرِ اقبال اور نسلِ نو

اقبال کی فکری سرگزشت کا نقطۂ عروج نسلِ نو کے فکر و عمل کا نغمۂ نشاط ہے۔ ان کی تمام تر توجہ کا محور نسلِ نو پر موقوف ہے۔ ان کے سبھی سروکار اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی ان کے روبرو ہیں اور رہ روِ فرزانہ بھی۔ اقبال کو کسی اور نسل سے نہ اتنی رغبت ہے اور نہ ہی رفاقت۔ اقبال نے ربِّ کریم سے اپنے فکر و پیغام کو جوانوں کے قلب و نظر میں اتارنے کی دعا مانگی ہے۔ یہ دعا کلام اقبال میں بہت ہی منفرد اور معنیٰ خیز ہے۔ کسی اور نسل کے لیے ایسی آرزو کا اظہار نہیں ملتا۔ یہ ایک اعلانِ عام ہے اور غور طلب بھی۔

بر جواناں سہل کن حرفِ مرا
بہرِ شاں پایاب کن ظرفِ مرا [1]

جوانوں کے لیے میرے فلسفہ کو سمجھنا آسان کر دے اور انھیں میرے فکر و نظر کی گہرائی کا شناور بنا دے۔ اس دعا اور حرفِ آرزو کی روشنی میں اقبال اور ان کے مخاطب کے درمیان ذہنی مراسم کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اقبال نے نسلِ نو کے ساتھ بچوں اور بوڑھوں کو بھی مخاطب کیا ہے ابتدائی دور کی شاعری میں بچوں سے کچھ زیادہ التفات ہے۔ کئی نظمیں موجود ہیں۔ ان میں زیادہ تر انگریزی نظموں کے ترجمے ہیں۔ دو ایک طبع زاد بھی ہیں۔ یہی بچے جواں ہوتے ہیں اس

لیے ان کی اصلاح وتربیت پر خاص توجہ ہے۔ ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بچوں کے بھی بڑے شاعر ہیں ابھی تک ان نظموں کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ نہ ہی ان کے برابر دوسری نظمیں تخلیق پاسکیں۔ اقبال کی ابتدائی فکر میں بچوں کی بڑی معنویت ہے۔ بعد کے دور میں بھی وہ بچوں سے مخاطب رہے۔ مگر جوانوں کے مقابلے میں نہیں وہ بوڑھوں اور بزرگوں سے بھی ہم کلام ہوتے ہیں۔ بزرگوں کی نصیحت آمیز باتوں سے نوجوانوں کو خاص نسبت ہے۔ اقبال بوڑھوں کے تجربات اور مشاہدات سے نسلِ نو کو بہرہ ور کرنا چاہتے ہیں۔ جو ایک کائناتی حقیقت ہے۔ اس ابتدائی دور کے فکروشعور میں اقبال نوجوانوں سے غافل نہیں رہے۔ متروک نظمیں جو ۱۹۰۰ء سے پہلے کی ہیں ان میں یہ اشعار موجود ہیں جو اقبال کا درس ونصیحت ہی نہیں جانِ جاں کی آرزو بھی ہے۔

جو دوڑ کے لیے میدانِ علم میں جائیں
سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں
دکھائیں فہم وذکا و ہنر یہ اوروں کو
زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم وفنوں [۲]

اقبال کی پیامی شاعری کا آغاز بھی اس دور سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے روبرو جواں سال ہی ہیں جو قوموں کی تقدیر بدل دینے کے لیے قدرت کی طرف سے مامور کیے گئے ہیں۔ یہ حکیمانہ درس ملاحظہ ہو۔

جس نے پایا اپنی محنت سے زمانے میں فروغ
ہے وہی اختر جبینِ کہکشاں کے واسطے
گلشنِ عالم میں وہ دل کش نظارہ ڈھونڈنا
آنکھ کو فرصت نہ ہو خوابِ گراں کے واسطے
یہ تو پوشیدہ ہے بے آرامیٔ محنت میں کچھ
جارہا ہے تو کہاں آرامِ جاں کے واسطے [۳]

مشقت ومجاہدہ، خوابِ گراں سے بیداری بے آرامیٔ محنت، اور آرام جاں سے

گریز عملِ پیہم کی یہ تاکید ہی اقبال کے فکری پیغام کا حاصل ہے۔ جوانوں سے اقبال کا یہ تخاطب اور تاکید ان کے فلسفہ وفکر کا نقطۂ آغاز ہے جو عمر کے ساتھ بہتر سے بہتر اور محکم ومربوط صورت میں ڈھلتا گیا۔ اقبال کسی دور میں نہ تو جوانوں سے غافل رہے اور نہ اپنے نظامِ فکر سے۔ ہاں وقت کے ساتھ فلسفیانہ تصورات میں گہرائی اور ہمہ گیری شامل ہوتی گئی ۔ بانگِ درا کے پہلے دور کی سب سے معرکۃ الآرا نظم تصویر درد ہے۔ جو ۱۹۰۴ء کی تخلیق ہے اس کا یہ شعر حیاتِ انسانی کے دستورالعمل کا الہامی قول ہے۔

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

راہِ عمل پر گامزن ہونا نظمِ عالم کا مقصود ہے اسی میں کامرانی اور سرفرازی کے اسرار پنہاں ہیں یہی ذوقِ تپش کا اضطراب پیدا کرتا ہے جو مزاحم قوتوں کو شکست دے کر سرخ رو ہوتا ہے۔ بانگِ درا کے حصۂ دوم کی پہلی نظم 'پیام' کا مطلع ہے۔

عشق نے کردیا تجھے ذوق تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصل سوز وساز دے

اسی حصے کی تیسری نظم طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام ہے یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اقبال پہلی بار براہ راست نوجوانوں سے مخاطب ہوئے ہیں۔ اس میں ان کے پیغام کی نوعیت مختلف ہے۔ جوانوں کو لطفِ خرام کی بشارت سناتے ہیں پہاڑ جیسا سکوت قاتلِ حیات ہے۔ بے مایہ مور کی طرح چلتے رہنے میں ہی زندگی کا انبساط ہے۔ جذبِ حرم سے ہی حجاز کی انجمن میں رونق ممکن ہے۔ اس نظم کے چند کلیدی الفاظ ہیں لطفِ خرام، جذبِ حرم، انجمن حجاز، ذوقِ طلب گردشِ آدمی، سوز وسازِ زندگی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان لفظوں کے استعمال میں ایک بڑی معنویت پوشیدہ ہے۔ انھیں الفاظ کے سہارے افکار کی موجیں طوفاں بدوش ہوکر ابھرتی ہیں۔ فکر کی ترسیل میں ان لفظوں کا بڑا اہم کردار ہے۔ اقبال نے ان لفظوں میں معانی کی دنیا آباد کی ہے۔ یہ الفاظ معالعۂ اقبال میں اصطلاح کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کے فکر کا ابلاغی نظام ان مخصوص لفظوں سے محکم اور مربوط ہوا ہے۔

یہ الفاظ تقریباً اصطلاحی صورتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ استعمالِ عام کے یہ الفاظ صدیوں سے زباں زد ہیں مگر اقبال نے ان میں فکر و نظر کے نئے مفہوم پیوست کیے ہیں۔ فکری ترسیل میں یہ علامت کی صورت بن گئے۔ لفظوں کو نئے معانی سے آشنا کرنا اقبال کی مفہوم سازی کا کرشمہ ہے۔ خود لفظ جواں بھی اسی میں شامل ہے۔ یہ کفولت اور بلوغت کے ماہ وسال کا محتاج نہیں ہے۔

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اگر جواں ہو مری قوم کے جسور و غیور

زندگی اور جسور و غیور کو جواں رکھنے کا خوب صورت اشارہ ہے۔ گویا یہ صرف انسان پر ہی موقوف نہیں ہے۔ پیام مشرق میں مچھلی کا شوخ بچہ اپنی جواں فطرت کا اعلان کرتا ہے کہ وہ ہر لحظہ جواں و رواں رہتا ہے اور گردشِ ایام سے بالاتر ہے۔

ہر لحظہ جوان است وروان است ودوان است
از گردشِ ایام نہ افزوں شد ونے کاست

پیامِ مشرق میں دوسری جگہ شاہین اپنے بچے کو جوانے اصیلے کہہ کر خطاب کرتا ہے

جوانے اصیلے کہ در روزِ جنگ

پیام مشرق کی ایک رباعی میں خطۂ زمیں کے جواں ہونے کا تذکرہ ہے۔

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد

ایک دوسری رباعی میں پھول کو بھی جواں کہا گیا ہے۔

ولے گل چوں جواں شد

گویا اقبال کائنات کی ہر شے کو جواں و دواں دیکھنا چاہتے ہیں تو کفِ خاک سے بنے انسان کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟ اسرارِ خودی میں ''در حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیات'' کا مطلع ہے۔

گرم خوں انساں ز داغِ آرزو
آتش ایں خاک از چراغِ آرزو

حرارت وتپش نور ونار، آتش وآگ، شعلہ وشرر وغیرہ کو اقبال نے جس کثرت سے شاعری میں نظم کیا ہے وہ فکر افروز ہے اور ادب میں ناپید بھی۔ یہ ان کی تفکیری ترسیل کا ناگزیر حصہ ہے۔ ان کی مدد سے ان کے فکری اسالیب کو نشاں زد کیا جا سکتا ہے اور انقلابی رویے کی بازیافت بھی ممکن ہو سکتی ہے۔

بانگِ درا میں خطاب 'بہ جوانانِ اسلام' عنوان کی دوسری نظم ہے۔ اسلاف کی فتح مندیوں کا ذکر کر کے حال کی پستی سے بیداری کے لیے غیرت دلائی گئی ہے کہ بزرگوں کی بخشی ہوئی قوت وشوکت کی میراث کو گنوا دینے کے سبب ہم جہاں گیری وجہاں بانی سے محروم ہو گئے ہیں۔ اقبال کے پیغام میں یہ فکر بڑی معنویت رکھتا ہے۔

لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

اس بے نظیر تخلیق کا آغاز حکیمانہ خطاب سے ہوتا ہے اور ہمیں دردمندی سے موضوع کی طرف متوجہ کرتا ہے اس نظم میں مخاطب اور غائب کی علامتیں دبیز پردوں میں پوشیدہ ہیں۔ تخاطب کا یہ لطیف پیرایۂ بیان اقبال کے یہاں عام ہے۔ نظم کا مطلع ملاحظہ ہو۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اس کے بعد تجھے کہہ کر براہ راست جوانوں سے مخاطب ہوئے ہیں۔

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرداری
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

اقبال کا اندازِ تخاطب بے حد متنوع اور دل کش ہے۔ وہ اپنے تخاطب کے لیے بھی یاد کیے جائیں گے۔ اس میں شوخی ہے اور بے باکی بھی۔ ناز ہے اور نیاز بھی کہیں خود سے تخاطب ہے اور کہیں اشیائے کائنات سے۔ خالقِ کل سے اکثر لہجے میں شوخی ہے تو بندگی اور عبدیت کا عاجزانہ اظہار بھی موجود ہے۔ جبریل وابلیس، حور وفرشتہ نے مخاطب

ہیں تو مظاہر فطرت کی ادنیٰ سے ادنیٰ تخلیق بھی اس تخلیق میں شامل ہیں۔ غیر مرئی اشیا سے تخاطب کی بڑی دلآویز مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔

اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو

اے خوش آں روزے کہ آئی وبصد ناز آئی

اے دردِ عشق اب نہیں لذت نمود کی

اردو کلیات میں تقریباً سو سے زائد بار لفظ ''اے'' کا استعمال ہوا ہے۔ ان میں سب سے دل نشیں اور حکیمانہ تخاطب جوانوں سے ہے۔ یہ ہم کلامی بہت ہی معنیٰ آفریں اور متنوع جہات پر مشتمل ہے۔ نسلِ نو کے خطاب میں اقبال نے علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے جن میں واضح اشارے موجود ہیں۔ اسرار میں نوجوانوں کو اپنی پسندیدہ علامت کو 'ہما' سے منسوب کیا ہے۔

اے ھما از یمنِ دامت اجمند
آشیانے ساز بر کوہِ بلند

خوش بخت نوجوانوں کو اپنے بال و پر کی قوت سے ھما کی طرح پہاڑ کی اونچی چوٹیوں پر آشیانے تعمیر کرنے کی ہدایت دی جارہی ہے۔ دوسرا اشارہ بھی فکر انگیز ہے۔ وہ تیز رو زمانے پر سوار نوجوانوں کی آمد کو خوش آمدید کہتے ہیں جو ممکنات کی دنیا کو فروغِ نظر بخشے گا۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

اس علامتی اشارے کی زندہ مثال ان کے صاحب زادے جاوید اقبال ہیں۔ جنھیں نسلِ نو کے نمائندہ پیکر کے طور پر مخاطب کیا گیا ہے۔ ان کے ذکر میں نوجوانوں سے ہم کلامی بہت ہی فکر انگیز اور موثرات سے معمور ہے۔ کئی نظموں میں انھیں سے براہِ

راست تخاطب ہے۔مگر پیشِ نظر یہی نسلِ نو ہے۔ پند و پیغام ہو یا اصلاح و انقلاب کے کئی حوالے نوجوانوں سے متعلق ہیں۔ جاوید نامہ میں فکر و فرمایش سے مربوط بہت اہم اور بے حد خیال افروز نظم ہے۔ یہ ندرتِ فکر و نظر کی تازگی، سرگرم عمل رہنے کا پرجوش پیغام اور اقبال کے اسلوبِ تخاطب کا ایک منفرد اظہار ہے۔ منفی اور منکرات کی نشان دہی میں اقبال کی دردمندی اور ان کے سوز و گداز کی کیفیات بھی اثر آفریں ہیں جو معنی کی پردہ نشینی کی پرواہ کیے بغیر معرضِ اظہار میں آ گئی ہیں۔ اس کا عنوان 'خطاب بہ جاوید' ہے۔ مگر قوسین میں ذیلی عنوان 'سخنے بہ نثرادِنو' ہے یہ جاوید نامہ کا اختتامیہ اور پیامی فکر و فلسفہ کی انتہا ہے۔ بعض ایسے نادر رموز و نکات پیش کیے گئے ہیں۔ جنھیں اقبالیاتی مطالعہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

جاوید نامہ بذاتِ خود فکرِ اقبال کی معراج ہے۔ اس فکری پرواز کی منتہا نثرادِنو سے خطاب ہے۔ ایک سو چھتیس اشعار کا یہ بیانیہ سرچشمۂ فکر اور اقبال کی آرزوئے حیات کا حاصل ہے۔ اقبال مزاج عصر سے الگ ایک دوسرے ولولۂ شوق کو آواز دیتے ہیں کہ اے پسر مظاہر عالم کے سوز و ساز کو دیکھو کہ ان میں ربِ کائنات کا اقرار بوئے جاں بن کر جن وانس کے ذکر و فکر میں جا رہی ہے۔ یہ اقرار صرف زبانی نہیں ہے یہ تیغِ بے نیام ہے۔ لا الہ ایک ضربِ کاری ہے۔

لا الہ ضرب است و ضرب کاری است

اسی کے ضرب سے عقل و دیں، علم و فن، امامت و سیاست اس پیکر خاکی کے طواف میں جوق در جوق مصروف رہتے ہیں۔ اس کی غیر موجودگی سے نوجوانوں کی تشنہ لبی و کم نگہی نورِ فطرت سے ناآشنا ہو رہی ہے۔ اس قبیلے کو محکم طور پر شیوۂ اخلاص کو اپنانے کی ضرورت ہے اور کم خورد کم خواب و کم گفتار باش پر قائم رہنا ہی نشاطِ زندگی ہے۔ اس کے فوراً بعد دوسرا شعر ان کے اصل کلام اور نقطۂ نظر کا اعلانیہ ہے جس کی تبلیغ و اشاعت اقبال کی زندگی کا شیوۂ گفتار ہے۔ قدرت نے غالباً ان کے فکر و نظر کی روح کو خارجی پیکر میں ڈھالنے کے لیے ہی انھیں شعری تخلیق کی بے پناہ قوت بخشی تھی ان کے فکری عقیدے میں

حق شناسی کے لیے خود اپنے وجود سے شناسائی لازمی ہے۔ یہ منزلِ اولیں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے وجود سے انکار کافری ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اپنے وجود کا منکر کافر سے بھی بدتر ہے۔

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است
منکرِ خود نزد من کافر تر است

یہ شیوۂ اخلاص ہے جو زندگی کو مستحکم بناتا ہے اور سلطان وسلاطین کے خوف سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی جواں مردی کے آداب ہیں جس میں فقر وغنا کو بہ شوق قبول کر کے اپنے وجود کے قندیل کو روشن رکھنے کی ضرورت ہے۔ مردِ جواں سال کی نکتہ رسی قابلِ رشک ہے۔ اقبال جوانوں سے مخاطب ہیں کہ اے فرزندانِ عزیز اپنے وجود کے عرفان کے لیے سخت کوشی اختیار کرو اور مزاحم قوتوں کو شکستِ فاش دو۔ فرزندانِ عزیز کہہ کر اقبال نے صرف اپنے بیٹے کو ہی نہیں دنیا کے تمام جوانوں کو آواز دی ہے۔ گویا جاوید اقبال ایک علامت ہیں۔ مراد سارے جہاں کی نسلِ نو ہے۔ نوعِ انسانی کے نوجوانوں سے خطاب کی دوسری اور سب سے مضبوط ومنفرد دلیل بھی انتہائی فکر انگیز ہے۔ جس سے اقبال کی وسعتِ نظری اور ہمہ گیر آفاقی حسیت کا یقین ہوتا ہے۔ اس خطابیہ کی روح اور فکرِ اقبال کا نقطۂ معراج بنی نوع بشر کا احترام واکرام ہے

حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست کافر ومومن ہمہ خلقِ خدا است
آدمیت احترامِ آدمی باخبر شو از مقامِ آدمی

انسانیت یہ ہے کہ وہ سب سے شیر وشکر ہو کر رہے اور قدم سے قدم ملا کے چلے۔ ایسا انسان اپنے معبود سے طریقِ زندگی حاصل کرتا ہے اور ہر ایک پر شفیق ہوتا ہے۔ نوجوانوں سے یہ تخاطب تاثرات اور محبتوں سے معمور ہے یہ بنی نوع انسان کی عالمی وحدت کا آفاقی ترانہ اور انقلابی نغمہ ہے جو نوجوانوں کے جان وتن میں سرمستی وسرشاری کے آہنگ بیدار کرتا ہے۔ فکر ونظر کی سطح پر نوجوانوں کے لیے یہی ذوقِ انقلاب ہے جو درونِ دل محبت کے بے کراں طوفان کو جنم دیتا ہے۔ یہ طوفان پہاڑوں کے دل چیر کر انھیں

خس وخاشاک میں تبدیل کر دیتا ہے۔

پس چہ باید کرد میں کئی مقام پر جوانوں کے کردار کو پر جوش رکھنے کے لیے حکیمانہ اظہار موجود ہے۔ نسلِ نو کے لیے فکر ونظر یا دین وایمان پر عزم واستقلال کے ساتھ ثابت قدم رہنا لازم ہے جب ہی خیر وشر کا فرق محسوس ہوسکتا ہے۔ اور ایک نگاہ میں عالم آب وخاک کو زیر وزبر کیا جانا ممکن ہے۔ کیونکہ اس کے گریبان میں ہزاروں قیامتیں موجود ہیں۔

در گریبانش ہزاراں رستخیز

اس جہانِ چارسو کو مسمار کر کے اپنی مرضی کی دنیا آباد کرنے کی ضرورت ہے۔

بر مراد خود جہاں تعمیر کن

دل کے اندر موجود ذوقِ انقلاب کو مردہ نہ ہونے دو۔ جہانِ کہنہ سے قطعِ تعلق کرد۔ دل کو یقین وثبات سے روشن کرو۔

دل زغیراللہ بہ پرواز اے جواں
ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں

نظم افتراقِ ہندیاں میں نوجوانوں کے لیے حکمت ودانائی کی باتوں کو باور کرانے پر زور ہے، ہم غلامی میں پیدا ہوئے مگر آزاد ہوکر موت کو مردانہ وار لبیک کہہ کر قبول کرو۔ یہ کام تمہارے اختیار میں ہے۔

در غلامی زادۂ آزاد میر

یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اقبال کی نظر میں نسل نو ہی جواں سال ہے جواں بخت اور جواں ہمت بھی۔ یہی ارتقائی صورت میں مردمومن یا مردکامل بن جاتا ہے۔ اور اس کا تخاطب مردمومن بندۂ مومن، بندۂ آزاد وغیرہ مختلف ناموں سے ہوتا ہے۔ یہی تصور ہے جوان کی فکر اور شعری محاورۂ بیان میں ہر سو نظر آتا ہے۔ ان ناموں کے ساتھ اشارات میں بھی یہی پیکر دیکھنے کو ملتا ہے۔

اپنی مرضی سے موت کو قبول کرنے کا مشورہ حکم وہدایت کا درجہ رکھتا ہے۔ بلکہ یہ

اقبال کے فکری پیغام کا اہم کردار ہے۔خوف وخطر کے اندیشوں سے بے نیازی کا سبق بار بار نظر سے گزرتا ہے۔اسرارِخودی میں یہ ایک مستقل عنوان ہے۔پس چہ باید کرد میں اقبال نے ایک جگہ نوجوانوں کے مہلک رویہ کی ملامت کی ہے کہ عصر حاضر میں بزرگ حمیت وحیا کو بھول بیٹھے ہیں اور جوانانِ عصرِ حاضر عورتوں کی طرح تن بدن کو سنوارنے اور سجانے میں مشغول ہیں۔

از حیا بیگانہ پیرانِ کہن
نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن

'پس چہ باید کرد' میں بھی اقبال نے ہند کے بوڑھوں اور جوانوں کی بدنصیبی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ایک فراست وبصیرت سے خالی ہے۔اور نسلِ نو محبت واخوت سے نا آشنا ہے۔ان وجوہات سے غلامی کی زنجیر پائی سے نجات نہیں مل رہی ہے۔

پیرِ مرداں از فراست بے نصیب
نوجوانان از محبت بے نصیب

اقبال نے جوانوں کی درجہ بندی بھی ہے انھیں جوانوں کی وہ جماعت پسند نہیں جو کوتاہ دست 'کورذوق' کم زور اور کم نگہی کا شکار ہو۔جو مستیٔ کردار وکفن سے نا آشنا شمشیر وسناں کے حرب وضرب سے محروم ندرتِ فکر وعمل اور ہنگامۂ پیکار سے عاری اور مرغانِ سحر کی بانگ سے خوف زدہ ہوتا ہے۔

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں
جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش[۴]

مثنوی مسافر میں ظاہر شاہ پر جو نظم ہے اس میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے اقبال زمان ومکان کے نظریہ کو پیش کرتے ہیں جو اس پس منظر میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ہمیں علم ہے کہ ان کا مخصوص نظریۂ زمان ومکاں ہے وہ نسل نو کو بھی اس کا حامل بنانا چاہتے ہیں کہ موجود ہی اصل ہے۔جو کچھ کر گزرنا ہے وہ اسی حال میں ممکن ہے۔اس میں دوش وفردا بے معنی ہیں۔تمہارا مستقبل تمہارے حال کا منتظر اور وہ اسی پر منحصر ہے۔

باتو گویم اے جوانِ سخت کوش
چیست فردا دخترِ امروز ودوش

ساقی نامہ میں اقبال نے جوانوں کو پیروں کا استاد بنانے کی دعا مانگی ہے۔مگرارمغان حجاز میں ساقیٔ ازل نے اس پرانی شراب کی فرمایش کی ہے جو پیرِ کہن سال کو نوخیز و جواں سال بنادے۔

بیا ساقی بیا راں کہنہ مے را
جوانِ فرد دیں کن پیر دے را

یہ بات اہم ہے کہ اقبال بوڑھوں کو اس بے پناہ قوت کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں جس سے خونِ گرم میں حرارت وحرکت کے شعلے لپکتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں کمزوروں میں طاقت وتوانائی پیدا ہو۔کنجشک فرومایہ کو شاہین سے لڑانے کی ترغیب اس فکر کی وجہ سے ہے۔بے مایہ کمزور پرندے میں ایسی جگرتاب طاقت پیدا ہوجائے کہ وہ شہباز وشاہین کو شکست دے سکے۔

اقبال نے ایک دوسری نظم فلسفہ زدہ سیدزادے کے نام ہے۔یہاں بھی علامت کے طور پر جاوید اقبال ہی روبرو ہیں۔ضربِ کلیم کی یہ نظم کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔سید زادے جاوید اقبال ہی نہیں پوری نسلِ نو ہے جس کے شعلۂ جنوں کے بے سوز ہونے پر اقبال رنجیدہ ہیں۔زندگی کی نامحکمی پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔مسلکِ زندگی کے روز وشب کو اسرارِ دیں سے محکم بنانے پر غور کرتے ہیں۔

بالِ جبریل میں پانچ اشعار کی حامل ایک نظم جاوید اقبال کے نام ہے۔اس مختصر نظم میں خودداری وخودشناسی کی تاکید کے ساتھ نسلِ نو کو مغربی تہذیب کے فکر وفسوں سے پرہیز پر زور ہے۔یہ ایک مستقل سبق ہے جو نوجوانوں کی ذہن سازی کے لیے ازبس ضروری ہے۔زرق برق زندگی کی آسائشوں سے گریز اور تن آسانی سے نفرت کرنے والی زندگی اقبال کی تربیت میں بنیادی پہلو ہے۔اس علامتی خطاب میں نسلِ نو ہی پیشِ نظر ہے

۔ان کی تاکید ہے کہ مغرب کے بارِاحساں سے بے نیاز ہوکر اپنی سرزمین سے سامانِ زندگی حاصل کرو۔امیری کے آداب ترک کر کے صبر وقناعت سے کردار کو محکم کرو۔

اٹھانہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا وجام پیدا کر

بال جبریل کے آخری شعری میں حکیمانہ اشارہ بڑی دل سوزی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اسے قوم کے لیے دُرناب سے بھی زیادہ بیش قیمتی اور جاں بخش قرار دیا گیا ہے۔انگریزی شراب کو زہر آب یعنی جان لیوا زہر کہنا اقبال کی مغربی تہذیب سے بیزاری کی شدت کا اظہار ہے۔قوم کے جواں سال بچوں کو آگاہ کرنے میں ان کی بے تاب شعوری فکری کاوش کو دیکھا جاسکتا ہے۔

زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خود دار وہنر مند

اقبال کی نظر میں انگریزوں کا اقتدار اور ان کا ظالمانہ رویہ بہت مذموم ہے۔وہ ایشیا کی سرزمین پر غاصب کے طور پر قابض ہوئے۔زمینِ ایشیا ان کی ستم رانیوں سے نالاں ہے۔اقبال کی انقلابی آواز نے مغرب کو جگہ جگہ مخاطب کیا ہے۔ان کا یہ خیال بڑی حقیقت کا انکشاف ہے۔

مشرق از سلطانیٔ مغرب خراب

جوانوں کی مغرب زدگی اور سامانِ آسایش سے بھرپور زندگی اقبال کو کھٹکتی ہے۔جن سے تن آسانی اور آرام پسندی میں اضافہ ہوتا ہے۔یہ زہر قاتل ہیں اور بدون تریاق بھی ہیں۔زندگی جہدِ مسلسل ہے اور آسایش قاطعِ حیات ہے۔اقبال کو ایسے عناصر سے نفرت ہے۔وہ نسلِ نو کو ان کی ضرر رسانی سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

نوجوانوں کو اپنی خاک وخمیر کے وقار کا احترام کرنا چاہیئے۔بجلی کی قمقموں کی جگہ مٹی کے دے سے محبت ضروری ہے۔تہذیب حاضر کی روشنی میں گم ہونے کی ضرورت نہیں اپنے وجود کی بقا کے لیے لازم ہے کہ اپنی تہذیبی شناخت کو تمام تر مزاحمتوں کے باوجود

فروغ دیا جائے ۔اس کی پاسبانی اور حفاظت کی جائے ۔ بالِ جبریل میں ''ایک نوجوان کے نام'' اقبال کی انتہائی فکر انگیز اور موثرات کی حامل نظم ہے ۔اس کے اشعار زبان زد خاص وعام ہیں اور وہ محاورۂ زبان میں ڈھل گئے ہیں تخاطب کے اسالیب اور آہنگ میں تنوع کے ساتھ ترسیل بے حجاب ہے، محسوس ہوتا ہے کہ فن کار نے ترکش کے تراشیدہ تیر استعمال کیے ہیں ۔اقبال نے گہرے تصورات اور بھرپور مؤثرات سے معمور مختصر نظموں کو دائمی زندگی بخشی ہے اس کی مثال یہ مذکورہ تخلیق بھی ہے ۔فلسفۂ پیغام اور ترسیل کی دل کشی سے مربوط ومرکب ایسی تخلیقات نے فن کی ابدی حقیقتوں کو منکشف کیا۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

طرزِ تخاطب میں رعنائی ہے اظہار بھی پرکشش ہے ۔مخاطب کے لیے اشاراتی الفاظ ترے، تجھ، تیرا، تو بہت ہی برمحل استعمال کیے گئے ہیں ایک شعر میں یہ الفاظ نہیں ہیں مگر کلام مخاطب سے ہی ہے ۔جیسے

نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم وعرفاں ہے

نہیں تیرا نشیمن، تو شاہیں ہے، نہ زور حیدریؓ تجھ میں جیسے الفاظ انداز بیان کے ساتھ ترسیل کی تکمیل بھی کرتے ہیں ۔اس نظم میں نسلِ نو کے لیے محکم لائحہ عمل اور منشور بھی پیش کیا گیا ہے ۔جس میں جدوجہد امیری وآسائش سے نفرت، غیروں سے بے نیازی، بلند نگہی، خودداری وخود شناسی ،عزائم کی تکمیل وغیرہ اہم فکری عناصر شامل ہیں۔ اقبال نے نئی تہذیب خاص طور پر مغربی تہذیب کی اکثر تنقید کی ہے جس کے فسوں میں نسلِ نو مقاصدِ حیات سے محروم ہورہی ہے بانگِ درا کی نظم تہذیب حاضر میں شعر ہے

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی ، یہ بیداری ، یہ آزادی یہ بے باکی

اقبال کہتے ہیں کہ اگر دلوں میں سوز وساز ہے تو اپنی آگ روشن کر گویا زندگی اپنے ہی لہو میں جلنے کا نام ہے۔اقبال نے بارہا تہذیب فرنگ سے نسلِ نو کو آگاہ کیا ہے۔ بال جبریل کا شعر ہے:

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

ان معروضات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی توجہ اور ترجیحات میں یہی نسل پیش نظر ہے۔تخلیق کے دوسرے عنوانات ذیلی اور ضمنی محسوس ہوتے ہیں۔درحقیقت یہی نوجواں پسندیدہ پیکر مردِ مومن بن جاتا ہے ۔ جو فلسفہ وفکر کا مرکزی محور ہے ۔یہی مردِ میداں ہے اور میرِ لشکر بھی نوری وحضوری اس کی نگہبانی کرتے ہیں یہی مرد کار قوموں کی تقدیر قلم بند کرتا ہے ۔اقبال کی امیدیں اور آرزوئیں اسی نسل نو سے وابستہ ہیں۔اقبال نے تاریخ عالم کی بڑی حقیقت کو اپنے نظامِ فکر کا اساسی عنصر قرار دیا ہے کیوں کہ انسانی فتح وشکست کی تاریخ اسی قبیلے کے خونِ گرم سے رقم کی جاتی ہے۔اس حقیقت سے چشم پوشی کرنا اقبال کے لیے ممکن نہ تھا۔غلام ملک کی آزادی کے لیے نوجوانوں کو ہی خونی کفن پوش ہو کر کارزار میں صف بستہ ہونے کی ضرورت تھی ۔ عدم تشدد اور فاقہ کشی موثرات سے محروم ہوتے ہیں ۔مصافِ زندگی کا معاملہ ہو تو سیرتِ فولاد کارگر ہوتا ہے ۔وقت کی شدید ضرورت نے بھی اقبال کو نوجوانوں سے مخاطب ہونے کے لیے مائل کیا۔اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اقبال کا فلسفہ وفکر عصری تقاضوں کا زائیدہ ہے اور تربیت یافتہ بھی ۔ فلسفہ کو خونِ جگر سے لکھنے کا یہی جواز ہے ۔ بے کسی و بے حسی کی بیماری نے خود شناسی اور جہاں بانی کے جذبے کو بیدار کیا۔ جو ذہنی غلامی کی قبا چاک کر کے احتجاج وانقلاب کے لیے برسرِ پیکار ہوا۔آسمان کو مسمار کرو اور ایک دوسری دنیا کی بنیاد رکھو طلوعِ اسلام کا یہ مصرع بے سبب نہیں ہے۔

فلک را بشگافیم وطرح دیگر اندازیم

فرمانِ خدا کے اشعار اسی انقلابی آواز کے ترانے ہیں۔

کاخ امرا کے درودیوار ہلا دو
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اقبال اپنے آئینۂ افکار میں آنے والے حادثات کی دھندلی تصویر دیکھ لیتے تھے ۔ یہ ان کی وجدانی نظر اور چشمِ بصیرت کا معمول تھا۔ انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ ہندی نوجوانوں کے ضمیر میں انقلابی روح انگڑائی لے رہی ہے۔ اقبال لبیک کہتے ہیں

در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید ۵

انھیں صف بستہ تیغ بند اور صورتِ سیماب مضطرب کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کے فکر ونظر کی شعلہ نوائی نے انھیں کارزار میں لا کھڑا کیا۔ بوڑھا شاہین اپنے بچے کو مردانہ وار جینے کا سبق سکھا رہا تھا کہ اپنے لہو کی آگ کو گرم رکھو اور سخت کوش بنو تا کہ زندگی کی تلخیوں کو شہد میں تبدیل کرسکو۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی نے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

اقبال کے گوشۂ دل میں محسوسات کی ایک دنیا آباد تھی وہ ہندی نسلِ نو کے ساتھ آفاقی وسعتوں میں بھی اس قبیلے کے جذبہ وضمیر کی تڑپ کو محسوس کررہے تھے۔ یہ ان کی بصیرت اور ادراک سے بھرپور دور بینی تھی۔ اقبال کے زمانے اور کرۂ ارض پر ہونے والے حادثات کو نظر میں رکھیں تو ان کے اشعار کی گہری معنویت واضح ہوتی ہے۔

ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

اس دروں بینی کی بدولت تقدیر عالم کو بے پردہ دیکھنے کے لیے اقبال نے ایک

نکتہ بیان کیا ہے کہ چشمِ دل کو کھلا رکھو۔

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جو یائے اسرارِ ازل
چشم دل واہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

اقبال نے نسلِ نو کی تقدیر شناسی کے ساتھ تقدیر سازی بھی کی ہے۔ان کے لیے منشور مرتب کیا ہے۔اس دستور کا پہلا ضابطہ اپنے وجود کا عرفان اور اس کی نگہبانی ہے بعد ازاں نا قابلِ تسخیر فولادی قوت کا حصول ہے تیسرا مرحلہ مثالی کرداروں کے اجتماع سے خیر کثیر سے بھرپور معاشرہ کا قیام ہے۔اس آئین کے مضمرات پر اکثر اظہار ہوا ہے۔قوموں کی تعمیر و ترقی نسلِ نو کے جدو جہد جاں فروشی کی منتظر ہوتی ہے۔اس میں خود اعتمادی اور عقابی نظر کے ساتھ سوز و گدازِ زندگی کا فولادی آہنگ بھی شامل ہوتا ہے۔فکر اقبال میں نا قابلِ تسخیر قوتِ فولاد حاصل کرنے پر بڑا زور ہے۔یہی وہ اکسیر ہے جو ممکنات کی دنیا کو بھی اپنی کمند میں لاتا ہے۔اقبال کا طرزِ تخاطب ''اے ہمتِ مردانہ'اسی پس منظر کو پیش کرتا ہے۔یہ ہمتِ مردانہ شمشیر و سناں کا محتاج نہیں ہوتا۔اقبال نے بڑے اعتماد سے کہا ہے:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں ہوتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد[۶]

یہ جواں نسل خود شناس و خود نگر ہوتی ہے۔ظاہر اور مادی اسباب سے زیادہ خالقِ کون و مکاں کے تعاون پر بھروسہ کر کے بے تیغ بھی لڑتا ہے۔اقبال کی نظر میں تاریخِ عالم کا وہ دور ہے جب اسلحوں سے بے نیاز مردانِ حق نے اپنے بازوں کو قوت سے بڑے بڑے قلمروں کے تخت و تاج کو پیروں کے تلے روند کر معاشرہ اور مملکت کی تشکیل کی تھی۔ ساقی نامہ کے شعر کو اسی سیاق میں دیکھیں:

تجھے کیا سناؤں تری سرنوشت
تو ہے فاتح عالمِ خوب وزشت

قبیلے کے قیام اور معاشرے کے استحکام میں ایسے ہی جوانمردوں کے خونِ گرم کے رنگِ حنا سے داستان رقم کی جاتی ہے۔اقبال نے اپنے لہو کی آگ میں جلنے کو شباب کہا

تھا۔شباب کی کئی شناخت اور تعریف اقبال کی نظر میں ہے۔ایک دوسری پہچان ملاحظہ ہو۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری ہے

جو شباب سکوت آشنا اور ہنگامہ ہائے شوق سے خالی ہو یا مستی کردار سے محروم ہو وہ اقبال کو پسند نہیں ہے۔بانگ درا کی نظم عشرتِ امروز میں شعر ہے۔

مقامِ امن ہے جنت مجھے کلام نہیں
شباب کے لیے موزوں ترا پیام نہیں

مسولینی جیسے آمر حکمراں کی انقلابی ندرت فکر وعمل کو اقبال اس لیے پسند کرتے ہیں کہ اس نے جوانوں کی ایک نسل کو تربیت دی ہے۔نظم مسولینی (بالِ جبریل) میں جواں سال قبیلے کے ضمیر کی انقلابی آہٹوں کو اقبال نے محسوس کرایا ہے۔

چشم پیران کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب

اس خیال کی توثیق ہو رہی ہے کہ اقبال کو ایشیا عرب وعجم ہی نہیں پوری دنیا کے نوجوانوں سے سروکار ہے یہ قوم وقبیلے تک محدود نہیں ہے۔ہاں مسلم نوجوانوں سے بہ طور خاص بوجوہ التفات ہے۔اس قوم کی حالتِ زار نے اقبال کی توجہ کو پہلی ترجیح میں شامل کرنے کے لیے مجبور کیا ہے۔یہ بڑی حقیقت کے پیشِ نظر تھی۔

براعظم ایشیا وافریقہ کے بیشتر مسلم ممالک یورپ کی غلامی کے لیے مجبور تھے۔ہندوستان کی آزادی ان مسلم ملکوں کی آزادی پر منحصر تھی۔اقبال کی فراست نے اس سیاسی حکمتِ عملی کو محسوس کرلیا تھا۔اقبال کے کلام میں ایشیائی بیداری ایک موضوعِ فکر کی حیثیت رکھتی ہے۔''لاہور سے تا خاکِ بخارا وسمرقند'' کا یہی پس منظر ہے۔اقبال کا تخاطب دنیا کی نسلِ نو سے ہی ہے کسی ایک جغرافیائی سرحد یا مسلک سے نہیں ہے۔وہ قوم کے نوجوانوں کی جسارت وغیرت کو للکارتے ہیں:

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور وغیور

قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں ۸

کلام اقبال میں بخارا، تاتار اور ایران کے نوجوانوں کے ذکر کے ساتھ جوانانِ عرب کا ذکر بھی ہے۔

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند
ایک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی نارسائی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے ۹

ان کے مخاطب جوانانِ عرب وعجم سبھی ہیں۔ اقبال اس نسلِ نو کو خوش آمدید کہتے ہین۔ انھیں جان وتن جانتے ہیں

چوں چراغ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من وجان شما

اقبال کو افغانستان کی سرزمین سے جو محبت اور وابستگی ہے وہ کسی اور خطۂ ارض سے نہ ہوسکی۔ بالخصوص وہاں کے نوجوانوں سے اقبال کو ایک جذباتی تعلق خاطر ہے۔ ظاہر شاہ کو خطاب کرتے ہوئے دلی سوز وساز کے ساتھ حکیمانہ بصیرتوں کی بھی تلقین کی ہے۔ وادی وکہسار کی خوگر قوم کے نوجوانوں کی پیشانی پر لکھی ہوئی تحریر کو اقبال پڑھ چکے تھے۔ ان کے لیے صبح نوروز کے امکانات کو روشن دیکھ رہے تھے افغانی نوجوانوں کی شہنشاہی نظر میں اقبال کی نگاہِ دوربیں کسی اور زمانے کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اے سخت کوش مجاہد وروز وشب کے تعینات کو درگزر کر کے افغانیوں کو وہ سوز وساز بخشو جس سے عصرِ حاضر صبح نوروز میں بدل جائے۔

باز تو گویم اے جوانِ سخت کوش چیست فردا اخترِ امروز ودوش
باز افغاں را ازاں سوزے بدہ عصر او را صبح نو روزے بدہ ۱۰

اقبال نے اہل چین کی بیداری کی بشارت دی ہے۔ کلام میں امریکہ وجاپان کا تذکرہ بھی فکر طلب ہے۔ براعظم یورپ کے کیف وکم کا ذکر کثرتِ تعبیر کے ساتھ موجود

ہے۔اس تفصیل کی اجمال یہ ہے کہ نسلِ نو کے وجود میں آفاق کے گم شدہ ہونے کا احوال کلام اقبال میں درج ہے۔اسی آفاق کی تلاش وجستجو اقبال کی سب سے بڑی یافت اور سرمایۂ فکر ونظر ہے۔انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ اپنے افکار کو جوانوں کے قلب میں اتارنا چاہتے ہیں، وہ تلاطم افکار کو منتقل کر سکے یا نہیں۔مگر ایک روشن رہ گزر کو اپنی فکر ونظر سے چراغاں کر گئے۔جس سے ہزاروں سال تک نوجواں منور اور مستفیض ہوتے رہیں گے۔

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی

اقبال کی نسلِ نو سے مخصوص نسبت کا ایک حکیمانہ نکتہ یہ بھی ہے کہ وہ قوت وشوکت کے مظہر اور محافظ ہوتے ہیں جس سے نظم عالم کا اعتبار واعتدال قائم رہتا ہے۔اس سے زیادہ اہم دوسرا زاویۂ فکر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان کے فکر وفلسفہ کا مرکزی محور خودی ہے۔ جونوجوانوں کے دلوں میں بستی اور بیدار ہوتی ہے۔یہی نسل خودی کی نمود ونگہداشت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔نوجوانوں کے پیکر خاکی سے خودی کا شعور مادی اور خارجی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔انھیں کے دلوں میں خودی اپنا نشیمن بناتی ہے۔گویا خودی وبے خودی کی خارجی یا ظاہری صورت یہی جواں سال افراد ہیں۔

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی وخود نگری کا [11]

یہ دعائیہ کلمات ہیں اور اقبال کی نشو ونمائے آرزو کی آواز بھی۔اقبال کے خصوصی التفات کا یہ ایک بڑا سبب ہے۔دراصل اقبال کے بے قرار دل کی تڑپتی ہوئی آرزو کو ملاحظہ فرمائیں بہ ظاہر یہ ہسپانیہ کے حسینوں سے خطاب ہے۔مگر حقیقت میں اقبال تمام جوانوں سے ہم کلام ہیں۔

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہیجنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں [12]

حسین کا اشارہ نسلِ نو کی طرف ہی ہے۔اقبال کی فکر میں حسن وجمال قوت

وشوکت سے ملزوم ہے۔جلال و جمال ایک ہی پیکر کی صفات ہیں۔اقبال نے اسی خیال پر اپنے نظریۂ جمال کی بنیاد رکھی ہے۔فکرِ اقبال میں آرزوؤں کی کثرت آرائی سے ان کی دلی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔یہی خواہشات ہیں جو دعاؤں کی صورت میں اکثر بیان ہوئی ہیں اقبال کی نسلِ نو سے ذہنی اور جذباتی وابستگی کا اظہار اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ربِّ جلیل سے اسی قبیلے کے لیے کثرت سے دعائیں مانگی ہیں۔انھیں کے قافلے میں اپنی متاعِ فکر اور حاصلِ زندگی کو لٹا دینے کا بے باک اظہار بھی کیا ہے۔ان کے کردار و گفتار کی پاکیزگی کے ساتھ عزائم کو سینوں میں بیدار رہنے کی آرزو کی ہے۔کلام میں دامنِ شباب کو بے داغ رکھنے کی دعا کا تکرار ملتا ہے۔

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ [۱۳]

ان کی شہرۂ آفاق نظم 'ساقی نامہ' کے دعائیہ اشعار ہمارے شب و روز کے محاورے میں شامل ہیں۔

خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے [۱۴]

ذرا ان کی اس دعا پر غور فرمائیں جسے اقبال نے اپنے آنسوؤں سے رقم کیا ہے۔ وہ دعا گو ہیں کہ اے ربِّ جلیل بجز اس دعا کے میرے دل میں کوئی دوسری آرزو نہیں ہے ۔کہ تو کبوتروں جیسے معصوم اور بھولے بھالے نوجوانوں کو عقابی نظر بخش دے۔

بجلال تو کہ در دل دگر آرزو ندارم
بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی [۱۵]

(اقبال اکیڈمی لاہور کے زیرِ اہتمام ۲۰۲۱ میں آن لائن دیے گئے توسیعی خطبے کی تحریری صورت)

حواشی

۱۔	جاوید نامہ	مناجات
۲۔	سرودِ رفتہ	فلاحِ قوم
۳۔	کلیاتِ باقیات	شعرِ اقبال
۴۔	ضربِ کلیم	محراب گل افغان کے افکار
۵۔	پس چہ باید کرد	پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق
۶۔	بالِ جبریل	اسرارِ پیدا
۷۔	ضربِ کلیم	محراب گل افغان کے افکار
۸۔	ضربِ کلیم	مسلماں کا زوال
۹۔	بانگِ درا	طلوعِ اسلام
۱۰۔	مثنوی مسافر	خطاب بہ پادشاہ ظاہر شاہ
۱۱۔	ضربِ کلیم	اے پیرِ حرم
۱۲۔	بالِ جبریل	ہسپانیہ
۱۳۔	بالِ جبریل	جاوید کے نام
۱۴۔	بالِ جبریل	رباعیات
۱۵۔	زبورِ عجم	غزل

اقبال کی داستان سرائی

'سرگزشتِ آدم' کے حوالے سے

اقبالؔ کے فکر وفن کی روح میں انسان کی ہی جلوہ نمائی ہے۔اشعار پر جہاں بھی نظر پڑتی ہے۔حضرتِ انسان کی شبیہہ وصورت کے ساتھ اس کے حال ومقام کا ذکر ملتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے لیے ہی ان کا فکر وفلسفہ وقف ہے۔ادبیات عالم میں شاید ایسی مثال نہ ملے۔گویا انسانی ترانہ یا نغمہ سازی ہی اقبال کی شناخت ہے۔یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس سے وہ کسی دور یا حال میں غافل نہیں رہے۔فکری ارتقا کے ساتھ بنی نوع بشر سے متعلق خیالات بہتر سے بہتر صورت گری کی طرف بڑھتے گئے اور بلند پروازی میں اضافہ ہوتا رہا۔ منزلِ کبریا تک رسائی اس کا ہدف ٹھہرا۔

انسان ارض وسما کی سب سے برگزیدہ تخلیق ہے اسے سب پر شرف حاصل ہے۔یہ مسجودِ ملائک اور خالقِ کون ومکاں کی سب سے محبوب شے بھی ہے۔اس کی ہزاروں صورتیں ہیں ۔مختلف زمانوں اور بستیوں میں اس کی ہدایت اور خیر خواہی کے لیے عظیم انسانوں کا نزول ہوتا رہا ہے۔تخلیق آدم سے پیغمبر اعظم وآخرؐ تک بعثتِ رسول کا سلسلہ جاری رہا اور ان کے بعد مفکروں اور دانش وروں کے قیل وقال کا سلسلہ حشر تک جاری رہے گا۔اقبال کی نظر میں اس طویل انسانی تاریخ کی بہت اہمیت ہے۔ان کی داستان پسند طبیعت کے لیے حضرتِ انسان کی کہانی میں بڑی دل کشی تھی۔ان کی تخلیق کا سرچشمہ یہی انسان ہے۔جو موجودات میں منفرد اور حقیقت میں رازِ

درونِ کائنات ہے۔ دنیا کے تمام انسان ایک وحدت سے منسلک ہیں۔ کیوں کہ سب اولادِ آدم ہیں۔ سب کی پیدائش اور پہنائی میں اسی مشتِ خاک کی کارفرمائی ہے۔ اقبال کی تمام تر توجہ اور آرزو وحدتِ آدم کے عظیم تصور پر مرتکز ہے۔ سارے قبائل ایک وحدت میں گم ہوں۔ جمعیتِ اقوام کی جگہ جمعیتِ آدم ہو۔ احترام آدمیت ہی منشائے مالکِ کون ومکاں ہے۔ یہ سب فکرِ اقبال کے اشارات ہیں۔

اقبال فکر وشعر کے ابتدائی دور سے ہی اس موضوع پر سنجیدگی سے متوجہ ہیں۔ عمر پچیس سال کی ہے۔ مگر افکار کی پرواز اور ہجوم طوفان بدوش ہیں۔ انسان ان کا ممدوح اور محبوب بھی ہے۔ جگہ جگہ انسانیت سے متعلق سوز وساز کی اضطرابی کیفیت نمایاں ہونے لگی ہے۔ متروک کلام یعنی ۱۹۰۱ء سے پہلے کی شاعری میں بہت ہی واضح تصور موجود ہے انہیں نظر انداز کر کے صرف بانگِ درا کے پہلے دور کے کلام پر توجہ ہے۔ کیوں کہ زیر بحث نظم ۱۹۰۴ء کی تخلیق ہے۔ اسی دور سے انسان پر غیر معمولی توجہ انکی اساسی فکر کا برملا اظہار ہے۔ اس سے نوجوان شاعر کے سروکار کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ یہ اشارہ قاری کی بصیرت کو بھی آواز دیتا ہے۔ ابتدائی دور کا یہ تصور اقبال کی فکری راہوں کو روشن کر رہا ہے اس موضوع سخن کو ماہ وسال کے آئینہ میں ہر دور میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اور ارتقائی صورتِ حال پر گفتگو بھی کی جاسکتی ہے۔ پہلی نظم ہمالہ (۱۹۰۱ء) کے آخری بند سے داستان سرائی شروع ہوتی ہے۔

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ سنا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا

اس دور کی سب سے طویل (انہتر اشعار) نظم 'تصویر درد' ہے جو تاثیر اور تاکید میں بے مثل تخلیق ہے۔ انسانی محبتوں سے سرشار یہ تخلیق اقبال کی بصیرتوں کی بے نظیر مثال بھی ہے اس کے اشعار زبان زد محاورے بن گئے۔ جن کی بازگشت سیاسی ایوان ومحل اور مسجد ومحراب میں بھی

گونجتی ہے۔اقبال کی محبتوں کا ترجمان یہ شعر ملاحظہ ہو۔

شرابِ روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجکو مست بے جام وسبو رہنا

یہ بات لطف سے خالی نہیں ہے کہ اقبال دوسروں کے احوال وکوائف کے ساتھ اپنی رام کہانی بھی سناتے ہیں۔ایک طرف بزمِ قدرت، انسان وحیوان اپنی سرگزشت سناتے ہیں دوسری طرف حضرت انسان رودادِ زندگی بیان کرتے ہیں۔اقبال سرگزشتِ آدم رقم کرتے ہیں اورآدم کے قصۂ رنگیں کو داستان سرائی کے لیے پسند کرتے ہیں۔ان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ اپنی کہانی قلم بند نہ کریں۔وہ بھی اولادِ آدم تھے۔آدم کی سرگزشت کے ساتھ اپنی سرنوشت بھی رقم کرتے ہیں۔اس دور کی ایک دوسری تخلیق 'زہداور رندی' بہت ہی لطف انگیز ہے جس میں مزاج کی سیمابی اورآزادروی کے ساتھ اور بہت کچھ منظوم ہوگیا ہے۔مکالماتی لب ولہجہ بہت ہی کیف پروراور داستانوی دلچسپی سے بھرپور ہے اقبال ہی قصہ گو ہیں اور ہیرو بھی۔منظر ومکالمہ بھی دل فروز ہے۔اس نظم میں ستائیں اشعار ہیں اور ہر شعر بستہ وپیوستہ ہے۔نظم صوت وحرف کے اعتبار سے مترنم اورخوش آہنگ بھی ہے۔

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں ہوں کہانی سے شروع ہوتا ہے۔مولوی صاحب صوفی منش، باعزت، عالم دین، اپنی کرامات کے ذاکر تھے۔وہ اقبال سے بھی واقف تھے۔ان کے لفظوں میں اقبال کی کہانی سنیے۔

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا — ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی
کچھ عار اے حسن فروشوں سے نہیں ہے — عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے — بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی — ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

ایک دن حضرت زاہد سرراہ اقبال سے ملے تو علامہ نے شکایت کی مولوی صاحب نے

فرمایا کہ تمہارے بارے میں جو کچھ کہا وہ محبت کے سبب تھا اور شریعت کی راہ دکھانی تھی۔ اقبال اپنے مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں۔

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا　　گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں　　کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اس قصے کے خاتمے کا شعر مطالعۂ اقبال کا لازوال محاورہ بن گیا۔ اقبال کی پُر اسرار شخصیت کا ایسا برملا اظہار کسی تحریر میں ممکن نہ ہو سکا۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

اس کہانی کے تین کردار ہیں زاہد، اقبال کے دوست اور خود اقبال۔ کہانی کے تینوں لوازمات متکلم، مخاطب اور غالب قصہ کی متحرک تصویریں ہیں یہ اقبال کی قصہ گوئی کی ایک عجیب مثال ہے۔ سرگزشتِ آدم بانگِ درا کے ابتدائی حصے کی (۱۹۰۴ء) کی تخلیق ہے اور کل اٹھارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اقبال بنیادی طور پر بیانیہ تخلیق کے انوکھے فن کار ہیں۔ غزلوں میں بھی حسن بیان کی ساحری موجود ہے۔ بال جبریل کی غزل منظر مکالمہ اور مخاطبے کی حیرت فروش مثال ہے۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا

اس نظم میں اقبال کا حسنِ بیان بڑی دل کشی رکھتا ہے۔ بیانیہ کے کچھ لوازمات ہیں سرگزشت اپنے وجود پر گزری ہوئی داستان سرائی کا نام ہے۔ اس کے لیے قصہ گو کے ساتھ سامع اور مخاطب بھی بزم آرا ہوتے ہیں۔ بہ ظاہر ان کا وجود معدوم ہوتا ہے۔ مگر فن کار تصور کر لیتا ہے کہ وہ سامعین کی محفل میں اپنی خودنوشت سنا رہا ہے۔ اسے ایک تمثیلی تخاطب بھی کہہ سکتے ہیں۔ گو کہ شاعر خود اپنی ذات سے ہم کلام ہوتا ہے۔ مخاطب جو غائب ہے محض خیال میں موجود ہے۔ خود کلامی کی ایک بلیغ صورت اس نظم کی ایک خوبی ہے اور حسن آفرینی کی بہت ہی خوبصورت مثال سامعین کی صف میں ارض و سما پر محیط پوری کائنات ہے جو وسعت اور پھیلاؤ میں بے کراں ہے جس کے حدود کا تصور بھی انسانی ذہن سے بالاتر ہے۔ انسان فرشِ زمین سے ہی نہیں بام

گردوں سے بھی مخاطب ہے چوں کہ آدم کی پہلی تخلیق ہی نہیں تمام تخلیقات عالم میں سب سے بلند و برتر ہیں۔ان کی ذات میں ارض وسما کی وسعتیں اور پہنائیاں سمٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہوگئی ہیں۔ایسے وسیع اور بے کراں پیکر کا خطاب کائنات سے ہی موزوں ہے کسی خطے، قبیلے، یا قوم سے مناسب نہیں ہے یہ ایک محدود زوایہ ہوگا۔ یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اقبال کا انسان صرف مشتِ خاک کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ بے کراں وسعتوں کی ایک علامت ہے جس میں زمین وآسماں اور زمان ومکاں کے امکانی حدود سمٹ کر علامت بن گئے ہیں۔اقبال کی ہی مثال ہے کہ آنکھ کے تِل میں آسمان کی وسعتیں اور سمندر ایک بوند پانی میں بند ہوگیا ہے۔

سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے

(ساقی نامہ)

پہنائیوں کا تقاضا تھا کہ اقبال قصہ گو کائنات سے گفتگو کے لیے روبرو ہوتے اور بزم کائنات کو اپنی رام کہانی سے روشناس کراتے۔متکلم اور مخاطب میں مساوی مراسم لازم ہوتے ہیں۔جس شان کی بزم اور سامع ہوں اسی عظمت کی داستان بھی ہو اور واقعہ نگاری بھی۔اتنا ہی عظیم ہو تب ہی سننے اور سنانے کا لطف ہے۔ایک دوسرا نکتہ بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ اقبال کا انسان جگہ جگہ بزم کائنات سے مخاطب ہوتا ہے۔اسی دور کی (۱۹۰۴ء) کی ایک دوسری بہت اہم نظم 'انسان اور بزمِ قدرت' ہے۔دونوں میں ایک بہت ہی فکر انگیز مکالمہ ہے۔ انسان اپنی روسیاہی اور زوال کے اسباب دریافت کرتا ہے۔

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیوں کر
نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز سیہ بخت سیہ کار ہوں میں

بزمِ قدرت انسان کو اس کے وجود کی آگہی بخشتی ہے اور انسان کو قدرت کی طرف سے دی گئی نوازشات کو یاد دلاتی ہے کہ

باغباں ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود

انسان کو عرفانِ ذات کا پہلا سبق نگارِ قدرت سے حاصل ہوتا ہے۔ فلسفۂ خودی کا مہتم بالشان تصور قدرت کے آغوش سے جنم لیتا ہے۔ خیال اقبال کا ہے۔ مگر مکالمے کا تقاضا تھا کہ بزمِ قدرت ہم کلام ہوتی۔ عرفانِ حق اور عرفانِ ذات کے لیے دنیا مین بس دو ذرائع ہیں جنہیں انفس اور آفاق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اپنی ذات اور مظاہر فطرت پر غور و فکر کی تاکید قرآن کا حکیمانہ ارشاد ہے۔ اقبال نے دوسرے مقامات پر حوالے دیئے ہیں۔ سرگزشتِ آدم کے مکالمے میں اس زاویہ کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کی شاعری کا بڑا حسن مکالماتی اندازِ بیان ہے۔ شاعری میں تمثیلی (ڈرامائی) اسلوب بذات خود ایک مقبول فن ہے۔ اس میں گفت و شنید کے ساتھ حرکات و سکنات کی متحرک تصویریں بڑی دلاویز لگتی ہیں۔ قاری کو قربت کا احساس شریک منظر بنالیتا ہے۔ سامع پر محویت کی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ خود ہم کلام ہونے لگتا ہے۔ اس طرح کے مکالماتی اسالیب سے اقبال کی شاعری بھری پڑی ہے یہ سب کسی نہ کسی طرح افسانوی یا داستانوی حسن بیان کے امتیازات سے بھر پور ہیں۔ بانگِ درا کی دوسری نظم 'حقیقت حسن' داستان سرائی کی عجیب و غریب مثال ہے۔ غیر ذی روح شے قصے کا آغاز مکالمہ سے کرتی ہے۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا

اب قصے میں مناظر فطرت کے شاہ کار کردار بن کر ابھرتے ہیں چاند تارے شبنم زمین و آسماں بہار شباب وغیرہ کہانی کو حسن کاری سے آراستہ کرتے ہیں۔ شکوہ و جواب شکوہ کا مکالمہ ایک دوسری نوعیت کا ہے۔ شکوہ میں صرف انسان بولتا ہے جواب میں ربِّ جلیل گویا ہوتا ہے۔ 'خضر راہ' میں شاعر اور خضر کا خطاب سوال و جواب کی صورت میں ہے۔ شمع و شاعری کی بھی یہی کیفیت ہے۔

پیر رومی و مرید ہندی سوال و جواب پر ہی مشتمل مکالمہ ہے'لینن' خدا کے حضور میں' ایک نئی صورت کی مثال ہے۔فارسی شاعری میں تو بہت سی نئی صورتیں ملتی ہیں ۔مکالموں کی کثرت سے اقبال کی صناعی اور پسندیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔طرح طرح کے مکالمے موجود ہیں ۔خدا اور انسان حور و شاعر، جبریل و ابلیس، پہاڑ اور گلہری، ایک مکڑا اور مکھی، ایک گائے اور بکری ، ہمدردی، ماں کا خواب، بچہ شاہیں اور ماہی، ابلیس اور مشیران ابلیس وغیرہ پچاسوں مقامات ہیں اس نظم میں مکالمے کی نوعیت مختلف ہے۔سوال و جواب نہیں ہے بلکہ خود کلامی ہے جو داستان گو کے بیانیہ حوالوں پر مشتمل ہے اس بیانیہ کا حسین آرٹ یہ بھی ہے کہ منظر و محاکات کی سحر کاری پر سامعین متوجہ ہیں۔نظم کا لطف دوبالا ہو گیا ہے یہ نظم متحرک اور رواں دواں تصویروں کا ایک مرقع بن گئی ہے۔واقعہ نگاری کا کمال ہے کہ ہر عمل جیتا جاگتا منظر ہے جو آنکھوں کے سامنے انجام پا رہا ہے۔ان مصرعوں کو دیکھیے ۔

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں

نظم کے تمام اٹھارہ اشعار منظر نمائی یا تصویر کشی کی سحر نگاری سے معمور ہیں ہر شعر ایک طویل کہانی کی روداد پیش کرتا ہے۔گویا مرقع سازی سے معمور یہ تخلیق اقبال کی نظم نگاری میں ایک منفرد مثال ہے اور لطف کی بات ہے کہ ابھی اقبال کی شاعری کا عہد طفلی ہے مگر نظم فن اور وسعت نظر کی پیش کش میں دور شباب کی ترجمان بن گئی ہے۔

اقبال کی داستان سرائی کا یہ حسن بڑی دل کشی کا سبب ہے کہ کرداروں کو لفظوں کے بولتے پیکر کے نفسِ گرم کی تپش بھی محسوس ہوتی ہے محسوسات کا منظر اپنی رعنائیوں کے ساتھ

تاثرات کی ایک کیفیت پیدا کرتا ہے۔ دو ایک ایسے منظر ملاحظہ ہوں۔

لہو سے لال کیا سیکڑوں زمینوں کو
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
بنادی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

اس نظم کی ایک اور دل چسپ خوبی ہے کہ داستان کی طوالت یا تفصیل کو صرف ایک شعر کے اختصار میں پیش کرنے کا ہنر فنی معجزہ سے کم نہیں ہے تلمیح کی یہ صورت گری کلام اقبال میں عام ہے۔ کبھی کبھی صرف دو لفظ میں پورے واقعے کی تفصیل کی طرف اشارہ عجیب لطف انگیز ہوتا ہے جیسے آتشِ نمرود، کشتیٔ مسکیں جان پاک دیوار یتیم، تیشۂ فرہاد جیسے سیکڑوں تلمیحاتی اشارے اقبال کے فنی کمالات کے مظہر ہیں۔ تلمیح کے لیے متعین الفاظ ہیں اقبال کے شعری عظمتوں کا یہ اعجاز ہے کہ انہوں نے کئی لفظوں کو پیکر کے اشارات میں تبدیل کیے ہیں۔ وہ اقبال کی ساختہ علامت بن گئے ہیں حضرت جبریل کا ابلیس سے سوال ہے

ہم دمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟

ابلیس کے جواب میں مستعمل چھ الفاظ میں ارض وسما کی تمام کیفیت سمٹ گئی ہے۔

یہی صورت نظم کے اختصار کو فنی اعجاز سے ہم کنار کرتی ہے۔ صرف اشارے ہیں تفصیل کی تفہیم سامع یا قاری کی صواب دید کے حوالے کر دی گئی ہے۔ ان میں بھی کہیں نام لے کر اور کہیں واقعہ کو کردار کی نشان دہی کے بغیر بیان کر دیا گیا ہے۔ مثلاً

سنایا ہند میں آکر سرودِ ربانی
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر

شاعر نے کمال احتیاط سے نام نہ لے کر قاری کو تلاش و تفصیل کے لیے آمادہ کیا ہے۔ اس مختصر نظم میں تخلیقِ عالم سے لے اٹھارہویں صدی تک کی عظیم داستانوں کو منظوم کرنا آسان

نہ تھا۔ مگر اقبال نے صرف تاریخ ساز کرداروں کو منتخب کر کے کائنات کی دراز داستان کو اشاراتی اسلوب دیا ہے۔ یہ واقعات عظیم ہیں جن سے ظہورِ آدم اور بنی نوع انسان کی ہدایت کے سنگِ نشاں نصب ہوئے ہیں۔ ان میں عالمی مذاہب کے پیشوا اور ایجادات کے ماہرین شامل ہیں جنھوں نے انسانی تاریخ کو بڑی فکری اور مادی انقلاب کی رہ بری کی ہے۔ کردار حضرت آدم کا ہے جنھوں نے مختلف زمانوں میں اور مقامات پر اپنے نقوش ثبت کیے ہیں۔ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسٰی، حضرت محمدؐ، گوتم بدھ کی صف میں عظیم سائنس دانوں کی کہکشاں بھی حضرت انسان کے وجود و نمود کی مختلف صورتیں ہیں جن میں آدم ہی کی جمال آفرینی کے جوہر نمایاں ہیں۔ قصۂ آدم کی صد رنگ تصویروں کا بیان اقبال کی مفکرانہ شاعری کا حاصل ہے روحِ ارضی کے استقبال سے کار جہاں دراز کا نہ ختم ہونے والا سفر جاری ہے اس نظم میں اقبال کی وسعتِ نظری قابل غور ہے مذہبی رہ نماؤں کے دوش بدوش نیم مذہبی یا غیر مذہبی اولادِ آدم بھی ہم نشین ہیں۔ اس طرح کی اجتماعی تصویر کاری کی دوسری مثال جاوید نامہ بھی ہے۔ جہاں پیغمبروں کے ساتھ دوسرے مفکر اور تخلیق کار بھی صف بستہ ہیں دوسرے لفظوں میں یہ نظم 'جاوید نامہ' کے روحانی سفر کی گزرگاہ کا نقطۂ آغاز بھی ہے۔

فنی اعتبار سے یہ ایک بہت ہی پر اثر تمثیلی تخلیق ہے جسے داستان گوئی کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے کہانی کی انتہا ایک نقطے پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا اختتام بہت معنی خیز ہے۔ حضرت آدم کی بے قرار روح کو جنت میں بھی سکون میسر نہ تھا۔ مختلف صورتوں میں وہ زمین پر تاریخ رقم کرتے رہے۔ پھر بھی اضطرابِ دل کو قرار حاصل نہ ہوا۔ کائنات کی گردش میں سرگراں رہنے کے باوجود حقیقت کا سراغ نہ ملا تو اپنے وجود کو ٹٹولنا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ جس صداقت کی تلاش میں انسان بے چین تھا وہ خود اپنے ہی دل میں خانہ نشین تھا۔ نظم کا اختتامی نقطہ بہت ہی خیال افروز ہے۔ اسے ذرا وسعت دے کر غور و فکر سے ہم آہنگ کیجیے تو فلسفۂ خودی کا مرکزی خیال کارفرما نظر آئے گا۔ اپنے وجود میں اپنی ذات کا عرفان ہی خودی کا حاصل ہے یہی اس نظم کا

اساسی خیال اور بنیادی فکر ہے۔اس نظم کے اثرات اقبال کی دوسری تخلیقات میں بھی نمایاں ہیں۔تقریباً تیس سال بعد یہ نکتہ پوری گرمی اور گراں مائگی لے کر 'بالِ جبریل' کی غزل کا حرفِ راز بن کر نمودار ہوا۔اور ضرب المثل کے طور پر مشہور ہوا۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

یا آدم کا خانۂ دل میں ہم نشین ہونا ہی من میں ڈوب کر سراغ زندگی کا پانا ہے۔سینۂ کائنات کا یہ راز وجود کے اندر پوشیدہ ہے۔جسے فاش کرنے کی ضرورت ہے۔اس نظم کا بنیادی خیال وحدت آدم کا عظیم تصور ہے جو وحدت کائنات اور تخلیق عالم کا سبب بھی ہے اقبال اس وحدتِ انسانی کی نغمہ سرائی کے لیے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

اقبال نے اپنی فکر کو شعری پیراہن میں جس طرح سجایا ہے۔وہ بھی ایک مثالی حیثیت ہے لفظوں کی ترکیبیں بڑی حد تک تنوع اور تصویر آفرینی سے آراستہ ہیں جیسے قصۂ پیمانِ اولیں، اوج خیالِ فلک نشیں، حرم نشیں، جام آخریں، خلاف معنیٔ تعلیم اہل دیں چشم مظاہر پرست جیسی اضافت سے بھرپور ترکیبیں نظم کی نغمگی میں مددگار رہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہ نظم نغمہ وآہنگ سے بھرپور خوش آہنگ صوتی آوازوں کا مرقع محسوس ہوتی۔قصہ گوئی اور مختلف کرداروں کی نمایاں تصویریں فکر ونظر کو پرنور کرتی ہیں۔خیالات کا ہجوم ہماری بشاشتوں کو سرخوشی بخشتا ہے۔اقبال کا مکالماتی اسلوبِ بیان ان کے شعری اسالیب کا ایک اعجاز ہے۔وحدتِ آدم اور اپنے وجود کی آگہی کے تصورات کو حضرتِ آدم کی تمثیل اور تشبیہ میں بیان کر کے اقبال نے نظم کو فکری آہنگ کے امتزاج سے لافانی شاہ کار بنا دیا ہے۔قصہ گو اقبال ہیں مگر انہوں نے صیغۂ غائب کے لافانی کردار حضرتِ آدم کو خوش نوائی کے لیے انتخاب کر کے معنی آفرینی کی دنیا آباد کی ہے۔کیونکہ ان سے بہتر کائنات میں کوئی دوسرا داستان سرا ممکن نہیں۔

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

اقبال زمان ومکاں سے ماورا مفکر شاعر

یہ شاید ہماری بقول اقبال دلیلِ کم نظری ہے کہ ہم ان کے فلسفہ وشعر کو ماہ وسال میں محدود کر کے مطالعے کے عادی ہوگئے ہیں ۔ یہ ہماری مجبوری بھی ہے کہ تعینات کے پھندوں کی اسیری ہمارا مقدر بن گئی ہے ۔ ہماری نظر ملکوں اور ملتوں کے دائروں سے ماورا کائنات کی پہنائی اور وسعتوں کی خبر سے اکثر بے نیاز رہتی ہے فکر اقبال کا یہی امتیاز ہے کہ وہ روز وشب اور ارض وسما کی بے کرانی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا ۔ وہ جہانِ مستعار سے گریزاں ہے ۔ وہ جہانِ نو خیز کی آرزو رکھتے ہیں ۔

جہاں وہ چاہیے مجھ کو ہوا بھی نو خیز

سِرِّ آدم اور ضمیر کن فکاں کی یہی آواز ہے کہ اس مستعار دنیا کو مسمار کر کے اپنی دنیا آباد کرے ۔ اقبال نے اپنی پہلی شعری تخلیق کے شروع میں اپنے افکار کی انتہاؤں سے ہمیں آگاہ کر دیا تھا ۔

ذرہ ام مہرِ منیر آن من است　　صد سحر اندر گریبانِ من است
خاکِ من روشن تر از جامِ جم است　　محرم از نازاد ہائے عالم است

ہم موجود پر قانع ہیں ۔ وہ عالمِ نازاد یعنی وجود میں آنے والے عالم نو کے اسرار سے کبھی واقف ہیں بالِ جبریل کا یہ شعر بھی اسی فکری نکتہ کی وضاحت کرتا ہے ۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

اقبال نے اپنے افکار کو جبرئیل آشوب کہا ہے جس سے لامکاں میں بھی اضطراب برپا ہونے کو ہے۔اسرارِخودی کے مقدمہ میں اقبال نے موجودنہیں مستقبل کے شاعر کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا ہے۔

من نوائے شاعرِ فرداستم

گویا دوش وفردا پر دارومدار نہیں فکرِ اقبال فردائے قیامت تک کی معنویت کے جوہر سے معمور ہے۔آپ اتفاق کریں گے کہ عہدِ اقبال کے کسی معاصر کی معنویت آج کے عالمی سیاق میں ذہنِ انسانی کے اضطراب کو آسودگی بخشنے سے قاصر ہے۔جہاں چارسو میں اقبال کے فکر وکلام کا گردان ہمارے صبح وشام کے معمول میں داخل ہے۔ایک صدی گزرنے کو ہے۔فکر اقبال پر کتنے آشوب گزرے۔تنقید کرنے والوں کی کمیں گاہیں شرمسار ہوئیں۔الفاظ کی حرمت پامال ہوئی۔مگر فکر اقبال سے مراجعت ان کا مقدر ٹھہرا۔اقبال کی مقبولیت اور معنویت میں متواتر اضافہ ہوتا رہا۔ہم روز وشب کے شمار کو تقویم کائنات سمجھتے ہیں اور غائب وحاضر کا استقبال کرتے ہیں۔حالاں کہ اقبال نے تاکید کی تھی۔

اسی روز وشب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان ومکاں اور بھی ہیں

انسانی فکر کی نارسائی ہے کہ وہ وجود کی بے کراں وسعتوں کو اپنی تفہیم کے لیے زمانے کو خانوں میں تقسیم کرکے مطمئن ہے مگر اقبال کہتے ہیں کہ انسانی کی تقدیر شکن قوت کا عرفان چاہیے جو ارض وسما کی تقدیر بدل دینے کا عزم سکھاتی ہے۔

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

انسانی فکر کے محدود تعینات سے اقبال نے آگاہ کیا تھا کہ چمنستان کی ہیئت بدل دینے کی قوت ہمارے نمود کا حصہ ہے وہ زمان ومکاں سے ماورا ایک ابدی حقیقت کی

مظہر ہے۔

خرد ہوئی ہے زماں ومکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لاالہ اللہ

درحقیقت اقبال کے فکر وشعر کا سب سے بڑا اعجاز اور امتیاز یہ ہے کہ وہ آنے والے ہر دور کے درد کی درمانی کرتا ہے اور ہر ملک وملت کے لیے بیاضِ مسیحا کا آزمودہ نسخۂ شفا ہے فراہم۔ اگر نظر شریکِ بینائی ہو تو کلام اقبال میں ہر دور کی شفاف تصویر نظر آئے گی یہ صاحبِ نظر کے ادراک وآگہی پر موقوف ہے۔

یہی ادراک نظر کو بینائی بخشتا ہے اور ثقافتی سرگرمیوں کے احتساب کو محسنات میں داخل کرتا ہے۔ تہذیب کی روح میں یہی احساس اور احتساب روانِ خون بن کر موجزن رہتا ہے۔ ثقافت کی بلندی وبالیدگی میں اسی ادراک وآگہی کے کرشمے معجزۂ فن بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ اسی کو اقبال دستِ قضا میں قوتِ شمشیر سے تعبیر کرتے ہیں جو پل پل کا حساب لینے اور دینے پر مامور ہے۔ انسانی خمیر کے مرکب میں یہی محلول جزو اعظم بھی ہے۔ مسجد قرطبہ کا حسبِ ذیل شعر اسی حکیمانہ نکتے کی اسرار کشائی کرتا ہے۔

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نوعِ بشر مختلف جبلتوں کا ایک دل نشیں مرکب ہے۔ اس ترکیب میں گوناگوں فیضان شامل ہیں۔ یہ کسبِ کمال بھی مرہونِ منت ہے ان جبلتوں کا فطری میلان اظہار اور نمود ہے۔ جس کے مختلف اسالیب ہیں۔ عام طور پر انھیں فنونِ لطیفہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے لاشعور میں تصورات کا ایک تلاطم ہمیشہ موجیں مارتا رہتا ہے اور اپنے عرفان وآگہی کی تکمیل کے لیے مضطرب رہتا ہے۔ یہ عمل ایک دوامی جدوجہد ہے جو غایتِ کمال کے حصول کے لیے نوردِ حضور کے گرد جولاں ہے۔ صحفِ سماوی کے متن میں موجود ایک بلیغ اشارہ ہے کہ ارواحِ عالم کی ایک اضطرابی کیفیت اکملیت کا احساس ہے۔ اس کی تکمیل

بھی ہوتی ہے مگر ساتھ ہی تشنگی بھی بڑھتی جاتی ہے ''رَبّنَا اَتمِمْ لَنا نُورَنا''تشفی اور تشنگی کا یہ خروشِ احساس کو وجود کے نہاں خانوں سے نکلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ وسائل خشت وسنگ ہو یا صوت وصدا رنگ ورقص ہو یا پیغمبرانہ دعوتِ عزیمت یا صدائے احتجاج ان سب کے باطن میں قوتِ نمو کی کارفرمائی ہے وہ خواہ خیر کی ہو یا شر کی، سپردگی ہو یا تسخیر کی ،تعمیر ہو یا تحریک کی ،شعری اقوال سے ہم واقف ہیں۔ فلسفی شاعر کا یہ قول بھی پیشِ نظر رہے:

میرے نفس کی موج سے نشو ونمائے آرزو

یہ صرف شعری اظہار نہیں ہے بلکہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ آرزومندی کے اعتراف اطراف میں اقبال نے جو دلیل دی ہے وہ صرف دانش وارانہ ہی نہیں بلکہ پیغمبرانہ شکوہ وسطوت کی حامل ہے۔

متاعِ بے بہا ہے درد وسوزِ آرزو مندی

یہی میراثِ آدم ہے جس سے مقام بندگی کا عرفان ممکن ہے اور جس کے عوض شانِ خداوندی نہیں قبول کی جاسکتی۔ یہی سوز وساز تخلیقی جبلتوں کو جنم دیتا ہے۔ جس سے ہنرمندی کے شاہ کار وجود میں آتے ہیں۔ فنون کی پرکھ کے جو پیمانے قائم کیے گئے ہیں ان میں سوزِ دروں کی سب سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ اسی سے فن جاوداں بنتا ہے جو سنگِ خارا کو بھی گداز کرتا ہے۔ تلمیحی علامتوں میں اسے کارِ خلیلاں بھی کہا گیا ہے کارگہِ زیست شہادتِ حسینؓ۔ رازی کی تفکیر اور غزالی کا تکلم سب اسی سے فیضیاب ہیں۔ آپ اہلِ نظر یا صاحبِ فن کے مزعومات پر نظر ڈالیں تو فن کی تخلیق کا یہ پُراسرار رمز مشاہدے میں آئے گا۔ یہاں اس بات کی بھی توثیق کروں گا کہ تخلیق کے پہلوؤں میں خوب وناخوب یا تسخیر وتحریف دونوں عمل کارفرما ہوتا ہے۔ یہ فن کار کی اپنی بصیرت ہے یا اس کا زاویۂ نظر کہ وہ ان میں کس کا انتخاب کرتا ہے اس کی ذمہ داری نہ تو فطرت پر ہے اور نہ صناعی کے اسالیب پر۔ ہاں فطرت جو سرچشمۂ تخلیق ہے اور منبعِ فن۔ اسے کریہہ المنظر اور کریہہ الصوت ہنرمندی سے تعلق نہیں ہے۔ مقدس آسمانی کتاب کے متون میں دو حکیمانہ

ارشادات قابل توجہ ہیں۔ وہ احسن الخالقین کی ترغیب دیتا ہے اسے مزاجِ کائنات اور اپنی صفاتِ خلق کا تعارف بھی اسی تصور سے کراتا ہے۔ دوسرا نکتہ بھی بڑا اہم ہے۔ فاحسن صورکم ۔گویا تخلیق کے خمیر میں حسنِ آفرینی موجود ہیں۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ خالق کل کے اسمائے صفات میں دو کو اساسی حیثیت دی گئی ہے۔ متکلمین کی جماعت ہو یا متصوفین کی۔ سبھی گروہ اس پر متفق ہیں کہ خلق اور علم کی صفاتِ عالیہ کی سب پر سبقت حاصل ہے۔ انسان صرف نیابت کی ذمہ داریوں پر ہی مامور نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود صناعی کا سب سے دلاویز پیکر شاہ کار ہے۔ اس کی فطرت میں بھی یہی دو عناصر دوسری تمام صفات میں عظمت رکھتے ہیں۔ نوع بشر کی اسی تخلیقی فعالیت سے ہنگامۂ عالم کی زیبائی ممکن ہوسکی ہے۔ وہ خود خیر کثیر کا مجموعہ ہے۔ کائنات اور اس کے نگہبان سے بھی یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقی فعالیت کو خیر کثیر کے اظہار سے سرفراز کرے۔

فنونِ لطیفہ کی تخلیق ہو یا تفہیم اگر وہ اس کی ترجمانی سے عاری ہے تو معاشرت وثقافت کے لیے زہر ناک ہے۔ معاشرت وثقافت کی تشکیل اقدار عالیہ کے اجتماع سے ہوتی ہے۔ اقدار کا سرچشمہ عرفان ووجدان سے سیرابی حاصل کرتا ہے۔ عرفان کی علوئیت ایک عظیم ترین تصور سے ارتعاش حاصل کرتی ہے۔ اس کے اقرار یا اعتراف کے بغیر اقدار کا تصور محض فریب نظر ہے اور اقدار سے عادی تخلیق انسان کو حیوان بنانے کی مکروہ ترین صورتیں ہیں۔ جس کی اجازت نہ کل تھی اور نہ آج ہے ہزاروں سال میں اقدار کا تحفظ بشری وراثت کا جز بنتا ہے اور معاشرت کو امتیاز بخشتا ہے جس کی بنا پر علاقے اور جماعتیں فنی فتوحات کے بلند مقام پر فائز ہوتی ہیں اور اپنی شناخت کے اسباب مہیا کرتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد کہنا چاہتا ہوں کہ اقدار کے اعتراف سے نہ صرف فن لازوال ہوتا ہے بلکہ پوری فکر منور ہوتی ہے اور دانش وبینش کے چراغ روشن ہوتے ہیں جو زندگی کی شبِ تاریک کو قندیل کی تجلیوں سے جہاں تاب کرتے ہیں۔ فن صرف شخصی انبساط کا وسیلہ نہیں ہے۔ جمالیاتی احساس کا پُرشکوہ مینارۂ نور ہے جس سے قلب ونظر کی دنیا تاب کار ہوتی ہے۔ تخلیق کا تفاعل فی نفسہٖ اس تقاضے سے دوچار ہے جو خالقِ اعظم کی شناخت کا

سبب ہے۔اس کے مقرر کردہ حدود ہیں مثال کے طور پر آواز اگر کرخت ہے اور سماعتوں پر بار ہے تو مذموم ہے۔اگر وہ نغمہ وآہنگ سے خالی ہے تو ناپسندیدہ ہے۔منظر یا مصوری اگر دل کشی سے خالی ہے اور بصارتوں کے لیے بوجھ ہے تو نا قابلِ قبول ہے۔کیوں کہ فطرت خود حسین مرقع تخلیق کرتی ہے اور انھیں کی ترغیب بھی دیتی ہے۔گویائی یا گفتگو اگر حکمت ودانائی سے خالی ہے تو زیانِ وقت ہے اثر آفرینی سے خالی کلام تضیع اوقات ہے۔بہ قول علامہ شبلی:

شعر اگر دامنِ دل می نکشد بانگِ خراست

علم جو روبہ عمل نہ لایا جاسکے ایسا ہی ہے جیسے گدہے پر لدی ہوئی کتابیں ۔ک**مثل الحمار یحمل اسفاراً** ۔جمال کے ساتھ کمالِ فن کا تلازمہ تخلیق کار سے کچھ اور تقاضا کرتا ہے جس کا ایک رخ دانائے راز کے یہاں ملتا ہے پرانے انتقادی اسالیب میں کہا گیا ہے کہ فن نقل کی نقل ہے اور فن کار نقل کا ناقل۔مگر اقبال کا جمالیاتی نظام فنی انتقاد میں اہم ترین نکتہ پیش کرتا ہے پورے کلام میں صرف ایک جگہ اظہار ہے کہ فن کار مظاہرِ فطرت کا ناقل نہیں بلکہ وہ موجود مظاہر سے کہیں زیادہ حسین وجمیل تخلیق کے مرقعے پیش کرتا ہے۔

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہوسکا وہ تو کر

فطرت خام مواد فراہم کرتی ہے یا نظائر پیش کرتی ہے ان موجود اشیا کی مدد سے کہیں زیادہ دلاویز خیالی پیکروں کی تزئین ممکن ہے۔ضرب کلیم کی نظم احرام مصر ہمارے مطالعے میں ہے۔استدلال یہ ہے کہ قدرت نے ریت کے ٹیلوں اور ٹکڑوں کی ارزانی بخشی ہے مگر ان بکھرے ہوئے پتھروں کے ٹکڑوں سے احرام مصر کی تعمیر انسانی تخلیق کا لافانی نقش ہے آفریں ہے ان ہاتھوں کہ جنھوں نے ابدیت کی یہ تصویر کھینچ کر انسانی تخلیق کو حریفِ فطرت بنا دیا۔اس گفتگو کی ایک اور جھلک پیام مشرق میں ملتی ہے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

جاوداں تخلیق کے بہ ظاہر دو اسباب ہیں۔ایک کا تعلق عرفان و آگہی یا نور و حضور سے ہے اور دوسرا کسبِ کمال کے لیے مشق و مزاولت کا عملِ پیہم ہے۔جس کی عدم موجودگی میں مشاہدہ کی برق نگاہی بھی کام نہیں آتی ۔انفس و آفاق کا عرفانِ نظر لازم ہے ۔مشاہدات کی گہرائی اور وسعت سے فن لازوال ہوتا ہے اس پر ثبت دوام کا اطلاق ہوتا ہے ۔موجود کے ساتھ تاریخ کے حادثات بھی مشاہدے میں بڑا فیضان فراہم کرتے ہیں ۔ان گزرے واقعات سے عزم اور عبرت دونوں تخلیق ہنر کو طوفان بدوش بناتے ہیں ۔ شعری تخلیق میں اقبال نے تاریخ کی داستان سرائی سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ان حوالوں سے فکر و شعر کو وسعتوں سے ہم کنار کیا ہے۔کہیں نام لے کر کہیں اشاروں میں اور کہیں تلمیحات کی صورت میں کھوئے ہوئے کی جستجو کو اپنی سرگزشت قرار دیا ہے۔ ؎

میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی

اقبال کے مطالعہ نے ماضی سے وابستہ ان تمام آویزشوں کی یاد تازہ کر دی جن میں فکری کشاکشوں اور رد و قبول کی بحث نے ہماری سماعتوں کو بہت متاثر کیا تھا اور منتشر قوتوں کو جنبش دی تھی۔ادب و دانشوری نے جداگانہ راہیں اختیار کر کے ان قوتوں کو منقسم کرنے کی تدبیر بھی کی تھی۔ بظاہر یہ بحث معدوم ہوگئی ہے۔بیسویں صدی کے نصف آخر نے مباحث کو نئی صورت دی ہے۔تشکیل و تردید کے توہمات میں اقوامِ مشرق کو مبتلائے آلام کیا گیا ہے حالانکہ فکر کی تابکار قوتیں وہم و گمان کے خس و خاشاک کو روندتی ہوئی ہمیشہ رواں دواں رہتی ہیں یہ انسانی سلسلۂ فکر کی نمایاں شناخت ہے۔خام فکر انسانی اقدار کو اکثر چیلنج کرتا نظر آتا ہے۔اس لیے علامہ نے آگاہ کیا تھا کہ فکر کی گمراہی انسان کو حیوان بنانے میں بہت معاون ہوتی ہے۔ دوسری طرف صحت مند فکر کی تازہ کاری سے قوتِ عمل کے طفیل مرئی پیکرِ وجود میں آتے رہتے ہیں۔ جہانِ تازہ کی تخلیق کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا۔ اس بدیہی حقیقت کے بعد تدبیر یا فکر پر عائد پابندی مہلک اور مکروہ ہے۔اقبال نے اچھی

بات کہی ہے کہ فکر وعمل سے ہی معجزات زندگی کی پیدائش ممکن ہے۔

ندرتِ فکر وعَمل کیا شے ہے، ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر وعمل کیا شے ہے، ملت کا شباب

لہٰذا ان مباحث پر مدلل اور مخلصانہ سلسلۂ کلام جاری رہنا چاہئے۔ افہام وتفہیم کے لیے معقولات کے دروازے کھلے رہیں تو تسلیم وتنکیر کی راہیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر انتخاب کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔ انکار کا احتساب بھی پوری بصیرت اور سخت گیری کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اگر اسے بے لگام چھوڑ دیا گیا تو یہ قوموں کی ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے۔ لہٰذا فکر کو اقدار عالیہ کے ماتحت ہی رہنا چاہئے۔ جس سے انسانی معاشرہ مضبوط اور مثالی صورت اختیار کرتا ہے۔

گفتگو ادب کی ہے جو صرف اپنے حسب نسب کا احترام کرتا ہے اس کا تعلق نہ ادیان سے ہے اور نہ آئین ہے۔ اس کے کچھ مسلمات ہیں جن کی بنیاد اقدار پر ہے۔ یہ اقدار انحطاط اور انکار دونوں سے ماورا ہیں۔ ان اقدار کا استحکام نوع بشر کی مادی وروحانی یافت اور فکری ارتفاع پر ہے۔ یہ ارتفاع، علوئیت اور الہام سے وابستہ ہے اور الہام وجودِ مطلق کے عرفان اور ایقان کے فیض بے پایاں کا ادنیٰ اظہار ہے جس سے تخلیق کے سرچشمے ابلتے ہیں اور جس سے فنونِ لطیفہ کی مختلف صورتوں میں مظاہر کا ایک دلکش مرقع مرتب ہوتا ہے اور دامن احساس کو جذب وکیف کی رعنائی بخشتا ہے۔ جس سے انسانی حواس جمالیاتی انبساط کی دولت بے بہا سے سرفراز ہوتے ہیں۔ انبساط کی یہ بخشش تخلیقی اظہار کی مرہون ہے۔ تخلیق خواہ لاتعداد مظاہر فطرت کی ہو یا فنون لطیفہ کے ان گنت دلآویز پیکروں کی۔ انبساط کی سرخوشی سے خالی تخلیقی عمل یا اس کا مظہر نا آسودگی کا موجب بن سکتا ہے تشفی کا نہیں۔ یہ فن کی ہنرمندی کا ایک مؤثر میزان ہے۔ جو اعلیٰ قدروں سے منور ہوتا ہے اس میں اسلامی اور غیر اسلامی کا بعد نہیں۔ مذاہب کی اساس اور اعلان اقدار کے اعلیٰ اصولوں پر قائم ہے اس لیے اجتماع اقدار کا دوسرا نام دین ہے جس کے حصول کے لیے معاشرہ مضطرب رہتا ہے فکر واحساس کے یہی جذبے غیر مرتب منشور قرار پاتے ہیں

۔فنکار لاشعوری طور پر بھی ان سے گریزاں نہیں ہوتا بلکہ تخلیقی فعالیت کے ہر مرحلے میں ان سے مدد حاصل کرتا ہے۔

اقدار کا تعلق صرف مذہب سے ہی نہیں ہے یہ گونا گوں نظام کے محاسن اعلیٰ کی کشید ہے۔ مذاہب، افکار، معاشرت، ماحول، تاریخی اور جغرافیائی حالات علم و عمل کی فروزاں اور فراواں تسخیری یافت سے اقدار کی روح برآمد ہوتی ہے اور یہی روح ذہنی، جسمانی اور معاشرتی تعمیر کو تکمیلی صورت بخشتی ہے۔فن نہ صرف ذریعہ اظہار ہے اور نہ سبب انبساط۔ یہ ایک جوہری توانائی کا مرکب ہے جو افراد اور معاشرے کو صحتمندی کے رُخ پر چلنے کے لیے جولانی بخشتا ہے۔

اسلام آخری الہامی مذہب ہے اسی لیے اس میں اقدار کی تمام ارتقاعی صورتیں اور ان کے ممکنات موجود ہیں۔ اقدار کا ایسا دلنشیں مجموعہ دوسرے نظام میں ناپید ہے۔ اسلام کا نقطۂ ارتکاز انسان اور اس کی معاشرت ہے۔اسی لیے فکر و تمدن کا کوئی بھی پہلو اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہے خواہ وہ حقائق کی باز آفرینی یا پیش کش ہو۔ وہ تمام استحصالی قوتوں کے انسداد کے لیے برسر پیکار رہنے کا ضابطہ متعین کرتا ہے۔اس سے زیادہ انقلاب آفریں تصورات اور احتجاجی کردار کہاں ہیں؟ مادہ کی تقدیس اور تقسیمِ دولت کے ایسے ابدی قوانین کس نظام نے وضع کیے ہیں؟ بنی نوع انسان کی بہبود بھی اس کا ماوا و منشور ہے۔ان اختصاص کی حامل تخلیق مذہب کی مہر ثبت کیے بغیر دائرۂ دین میں شامل ہے۔تصوراتی سطح پر فکر کے ساتھ ادب بھی وسعت طلب ہے اور اس دائرہ تخلیق کو توسیع دینے کی ضرورت ہے۔کسی بھی تحریک کے زیر اثر تخلیق پانے والا ادب بھی اسی زمرے میں شامل ہے دوسری طرف وہ ادب ہے جو اقدار کا حامل تو ہے مگر ادبی یا جمالیاتی انبساط سے خالی ہے۔اقبال نے اشارہ کیا ہے۔

کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

صالح فکر ہی توانا تخلیق دے سکتی ہے۔عالمی ادب کے مطالعہ سے یہ بات اور بھی روشن ہو جاتی ہے۔اقبال نے بار بار حوالوں سے یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ شاعری

،صورت گری اور داستان سرائی غرض تمام فنونِ لطیفہ انسانیت کی تعمیر میں معاون ہوں تو قابل قبول ورنہ بہ صورت دیگر قابلِ نفریں ہیں۔فن کا مقصد دائمی انبساط وعرفان کی بخشش ہے۔فن فکر فروزاں سے جنم لیتا ہے اور قارئین کو فرحت سے سرشار کرتا ہے۔جس سے جنبش وحرارت پیدا ہوتی ہے اور عمل کے لیے آمادہ کرتی ہے۔وہ فن جو خواب آور ہو یا خیالات میں گم ہو جانا سکھاتا ہو مذموم ہے۔فن تحریک کا موجب ہوتا ہے۔اقبال نے تاکید کی تھی کہ وہ فن زہرناک ہے۔جو

روح کو کرتے ہیں خوابیدہ بدن کو بیدار

یا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا وہ ہنر کیا

تخلیق تشکیل وتعمیر سے عبارت ہے۔فنونِ لطیفہ کا مقصد بلند اقدار کی اشاعت اور فروغ ہے۔قوائے عمل کو مضمحل کرنے والے ہر شبیہ اور شعر اس مقصد کے منافی ہیں جس سے پرہیز لازم ہے۔

اقبال وطن کی عظمت وآزادی کا نغمہ ساز مفکر شاعر

انسانی خمیر جائے پیدائش کی مٹی کا حیرت فروز مرکب ہے۔ وجود ونمود کے بعد وہ انجام کار اسی مٹی کے آغوش میں آسودۂ خاک ہونے کی آرزو بھی کرتا ہے۔انسان نازک ترین محسوسات کا ایک دل نشین مجموعہ ہے۔شادی وغم یا رنج وراحت سے وہ بہت جلد مشتعل اور متاثر ہوتا ہے۔کبھی کبھی یہ اثرات اضطرابی کیفیات کے حامل ہوتے ہیں اس کی سرشت میں زود حسی ہے اور بے بسی بھی۔اس کے جذبات کی گزرگاہیں بھی بے کراں ہیں۔وہ بشری پیکروں کے ساتھ غیر مرئی مجسموں سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔شجر وحجر کے علاوہ ارض وسما کے مختلف مظاہر سے اس کی والہانہ چاہتیں بھی اسے بیقرار رکھتی ہیں۔بود وباش میں نزدیک ودور سے قائم ہونے والی نسبتیں اس کے خاک وخمیر کا جز بن جاتی ہیں ۔آس پاس کی بے حس اور بے جان چیزیں بھی اس کے جذبات اور اظہار کا حصہ ہوتی ہیں درودیوار سے محبت ایک فطری شے ہے جائے پیدائش سے ایک والہانہ تعلق ہی حب الوطنی کے جذبے کو فروغ کر دیتا ہے۔مقام کے متعلقات سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جو کبھی کبھی دیوانگی کی حد تک بڑھ جاتا ہے اپنی جائے پیدائش کے علاوہ روئے زمین کے دوسرے علاقوں کو اپنا حریف سمجھنے لگتا ہے۔

تخلیق ہو یا تعمیر،تصویر آفرینی ہو نغمہ سازی سب میں مقامی اثرات کی پیش کش ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ سب کسی نہ کسی مقام کے نام ونسب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

شاعروں نے تو خاص طور پر اپنی شناخت مقام و دیار سے قائم کی ہے۔ دکنی، دہلوی، لکھنوی تو تھے ہی شہر وقصبات کی نسبت سے معروف شعراء کی پہچان ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ اردو زبان وادب اپنی جائے پیدائش و پرورش سے بے گانہ رہتی۔

ہماری فکری روایتوں میں ایک خیال انگیز مقولہ عام رہا ہے جس میں زمینِ وطن کا کانٹا بھی گل وریحان سے بہتر اور وطن کو ملکِ سلیماں سے زیادہ محترم قرار دیا گیا ہے ۔ارضِ وطن اور اس کے متعلقات یعنی مناظر ومظاہر فطرت، چرند و پرند، شجر وحجر، موسم ومحاکات، جذبہ واعتقاد آثار واساطیر کے ذکر سے پوری اردو شاعری بھری پڑی ہے۔ سب سے پہلے مقتدر شاعر قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک کوئی فن کار ایسا نہیں ہے جس کی تخلیق ان عناصر سے خالی ہو۔ مختلف تہواروں کے دل فریب تذکرے کے علاوہ برسات کی مختلف کیفیات کا بیان ایک فطری اظہار رکھتا ہے۔۔ موسمِ برشگال میں شوانی کا دیوانی بننا خوب لبھاتا ہے۔ شاعری کا بابا آدم ولی کا کلام کثرتِ بیان سے معمور ہے۔ ولی کی خوش بیانی دیکھیے کہ وطن کی محبت نے اُسے یوسفِ ثانی بنا دیا۔

جامی نظامی مت کہو اب شعرِ خاقانی ہوا
حب الوطنی کی مصر سوں اب یوسفِ ثانی ہوا

ولی کی عاشقانہ محبت کا ایک دوسرا رُخ ملاحظہ ہو۔

ہے سبزہ زار حسن سراپا سوادِ ہند
خوبانِ بانمک سوں بھرا ہے سوادِ ہند
عشاق با صفا کے ہے سینے میں یادِ ہند
پیتم کے زلف پیچ دِسا مجھ سوادِ ہند

ولی سے غالب تک ابنائے وطن سے محبت کا ایک سلسلہ نہیں بلکہ سیل ہے۔ جو بے اماں ہے اور بے کراں بھی۔ اس سیل سبک سیر میں شمالی ہند کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر شاہ حاتم دہلوی کے کلام کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ جس میں کہا گیا ہے کہ کابل وقندھار

کو ہند پر قربان کیا جا سکتا ہے۔

سوادِ ہند کا جس کو مزا ہے　　وہ لذت سے جہاں کی آشنا ہے
گلوں کے کان میں کہتی ہے بلبل　　یہی کشمیر ہے اور یہ ہے کابل
وہ بے شک وقت کا شاہِ جہاں ہے　　جو کوئی متوطنِ ہندوستاں ہے

ارضِ وطن کا یہی سوز و ساز ہے جو غالب کو کاشی تا بہ کاشاں کہنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اس تصور کو اقبال ارتفاعیت کی انتہا تک لے جاتے ہیں۔ رودِ کاویری کے پانی کو دجلہ و فرات سے زیادہ مقدس اور محترم کہتے ہیں۔

اے مرا خوشتر زجیحوں وفرات
اے دکن را آبِ تو آبِ حیات

۱۸۵۷ء کے جاں کاہ انقلاب کے بعد حب الوطن کا جذبہ نئے تصورات لے کر ابھرتا ہے۔ انگریزوں کی غلامی نے اس جذبے کو طوفان بدوش بنایا۔ یہ قدرتی عمل بھی تھا۔ قید و بند میں ہر ذرۂ زمین سے محبت جاگتی ہے اور سرفروشی کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ انگریزی مظالم کی خوں چکاں داستان کو انگیز کرنے کا یہ ایک نسخۂ شفا تھا اور تمام باشندوں کے دلوں کو گرمانے کا مؤثر وسیلہ بھی۔ حب الوطنی سے معمور تخلیقات کا ایک گراں مایہ سلسلہ شروع ہوتا ہے مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے ۱۸۶۸ء میں 'حبِ وطن' کے نام سے انگریزی نظم کا ترجمہ کیا۔ دوسری نظم مولانا محمد حسین آزاد کی ۱۸۷۵ء کی یادگار ہے جو تقریباً دو سو اشعار پر مشتمل ہے۔

اے آفتابِ حبِ وطن تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
بن تیرے ملکِ ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینے کے داغ ہیں

مولانا حالی کی بصیرت اور پُر نور نظر سے یہ موضوع کیوں کر اوجھل ہو سکتا تھا

۔انہوں نے ایک نئی جہت پیدا کی اور اسے ایمان وعقیدے سے جوڑ دیا۔ایک فکر انگیز مثال بھی پیش کی کہ پیغمبر آخر الزماں کو ہجرت کے وقت ارضِ وطن کی محبت نے بہت بیقرار کیا:

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی
سیدِ بطحیٰ کے ہم راہی
رشتے الفت کے سب توڑ چلے
اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے

اردو شاعری میں وطن دوستی کا سب سے مہتم بالشان دور اقبال سے شروع ہوتا ہے۔جن کی نظموں سے ہندوستانیوں کے دلوں میں جذبۂ وطن کو نور وسرور کی لذت بخش دی۔تحریکِ آزادی کی مشعل روشن ہوچکی تھی۔ ہر باشعور شہری افتاں وخیزاں کاروانِ آزادی میں شامل تھا۔اتحاد واتفاق کا صور پھونکنے میں اقبال نے فکر وخیال کی عظمت وسرفرازی بخش دی۔خاکِ وطن کے ہر ذرے کو دیوتا کہنے میں اقبال نے کمی نہ کی اور اسے جزوِ جذبات قرار دیا۔ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت،تصویر درد اور نیا شوالہ ان چار نظموں کے مقابل ملک کی پوری شاعری کا محاکمہ کیا جاسکتا ہے اردو کے علاوہ یہ وابستگی کہیں نظر نہیں آتی۔اقبال آخری سانس تک حبِ وطن کے جذبۂ صادق سے سرشار رہے۔

ان کا کوئی شعری مجموعہ ایسا نہیں ہے جو ارضِ وطن اور اس کے متعلقات سے خالی ہو۔ابتدائی دور کے تصورات پوری شاعری پر سایہ نشین ہیں۔وہ معبد اور نئی بستی کی تعمیر کے لیے کوشاں تھے جہاں من وتو کی تفریق نہ ہو۔وہ من کی دنیا ہی کو دولتِ دین ودنیا سمجھتے رہے۔ان کی بے مثال غزل کا وہ شعر ایک بڑی حقیقت کا اشارہ ہے۔

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ وبرہمن

۱۹۳۵ء کا یہ خیال ان کے ۱۹۰۴ء کے جذبہ وفکر کی ترجمانی کررہا ہے:

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیست کی پلا دیں
شکتی یعنی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

ہماری پوری وطنی شاعری اقبال کے جذبۂ حب وطن پر سبقت لے سکی۔ان سے بہتر نظمیں تخلیق پا کر ہمارے روز وشب کا محاورہ نہ بن سکیں۔اس محدود موضوعِ سخن میں بھی اقبال منفرد نظر آتے ہیں۔حیرت ہے کہ اقبال اس تعلق سے حدف بھی بنے رہے۔انہوں نے ایک منظر نامہ تیار کیا اور نیا موضوعِ سخن فراہم کیا چکبست ،سرور،ظفر علی خاں ،اکبر، جیسے تخلیق کاروں کی شاعری آوازِ درا بن گئی اور شعر وسماج کے ہر زاویۂ نگاہ پر ابر بہار بن کر برسنے لگی

سیاسی اضطراب نے ملک کی وفاداری کو نئے آہنگ سے ہم کنار کیا۔تحریکِ آزادی کا ولولہ جہاں آشوب نغمے میں بدلنے لگا سب سے پہلے وطن کی عظمت کا احساس دلوں میں جاگزیں کرنا مقصودِ فطرت قرار پایا۔ ہندوستان کی عظمت وحرمت کو باور کرانے کی تدبیریں کی جانے لگیں۔اقبال نے ارض وطن کی عظمت کو اپنے شعر وآہنگ کا جزو اول قرار دیا۔جگہ جگہ یہ اعتراف مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔

اقبال ملک وملت کے بے نظیر نغمہ ساز ہیں۔یہ نغمے بڑے ہی دل کش اور دل نواز ہیں۔ان میں صرف شعری تخیل پردازی اور محض بیانیہ انداز نہیں ہے۔ بلکہ جذبہ واحساس کی شدت اور اقرار واعتراف کی صداقت بھی شامل ہے۔اظہار کی یہ سچائی ان کے کلام کو پُرسوز بنا دیتی ہے۔ بڑائی بیان کرنا یا تعریف کرنا مدح کہلاتی ہے۔ جو اکثر وبیشتر مبالغہ یا غلط بیانی بن جاتی ہے۔وہ تعریف دلوں میں اترتی نہیں۔لیکن یہی تعریف رگِ جاں میں لہو بن کر رواں ہو تو محسوسات جاں گداز بن جاتے ہیں۔اقبال کے اظہار میں صرف عظمتوں کا بیان ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اندرونِ دل کے جذبات بن کر شعر میں ڈھل گئے

ہیں۔

ملک کا تصور ایک خیال ہے۔لیکن جب یہ خیال ملک کے متعلق زمین وآسماں، پیڑ، پودے، کوہ وکوہسار، ندی نالے، چرند و پرند، انسان وحیوان وغیرہ تمام اشیاء کا احاطہ کرتا ہے تو ملک کی زندہ اور جاگتی تصویر سامنے ہوتی ہے۔سرحدوں اور سمندروں سے اس کا تعین ہوتا ہے۔ان تمام جاندار اور بے جان چیزوں کا ذکر ملک کی عظمتوں کے اقرار میں شامل ہے۔اقبال کو دیکھیے کہ ہندوستان کی ثناخوانی سے ان کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلی نظم ہمالہ ہے جو ۱۹۰۱ء کی یادگار اور اقبال کے فکر وشعر کا سرنامہ ہے۔ہمالہ کو علامت نہیں حقیقت تسلیم کر کے اسے ملک کی سب سے بڑی عظمت کا نشان قرار دیا ہے۔اے ہمالہ اے فصیل کشورِ ہندوستاں چومتا ہے جس کی پیشانی کو جھک کر آسماں اسی عظمت کا اظہار ہے۔

اسی دور کی ایک نظم ہے۔سرگذشت آدم۔جس کا ایک مصرع جذبے یا احساس سے بالاتر ہے۔بلکہ وہ عقیدہ ویقین کا والہانہ اقرار ہے۔

میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

کہہ کر اقبال نے سرزمین ہند کے تقدس کی نشان دہی کی ہے اور ناز بھی کیا ہے۔ اگرچہ یہ روایت بہت معتبر نہیں ہے۔دوسری بات بھی غور طلب ہے۔

سنایا ہند میں آکر سرودِ ربّانی

اگر اس پر غور فرمائیں تو اسے عظمت کا سب سے بڑا اعتراف تسلیم کرنا پڑے گا۔ ذرا ایک دوسرے پہلو پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے اس شعر سے پہلے جو شعر ہے وہ یہ ہے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں

اس خیال کے معاً بعد مذکورہ بالا شعر رقم کیا جانا بہت ہی معنیٰ خیز اور پُر اسرار ہے ۔اس نظم کے بعد فوراً دوسری نظم شروع ہوتی ہے۔جو 'ترانۂ ہندی' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ہندوستانی ادبیات کی سرنوشت ہے۔جسے اقبال نے اپنے الہامی قلم سے رقم کی ہے۔

سارے جہاں سے اچھا کہہ کر اس کی عظمت پر اپنی بے پناہ محبت کی مہر ثبت کر دی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے ملک کو دنیا کے تمام ممالک سے بہتر سمجھتا ہے۔ ہر انسان کو حق حاصل ہے۔ ایہ ایک جبلی یا فطری تقاضا بھی ہے۔ لیکن اقبال نے جس وابستگی کا اظہار کیا ہے وہ بہت انوکھا اور دل چسپ ہے۔ دوسرے ممالک کو تاریخ کے آثار قرار دے کر ہندوستان کو زندۂ جاوید کہنا ان کی بے پناہ محبت کی دلیل ہے۔

یونان ومصرو روما سب مٹ گئے جہاں سے

کہنا قطعی مناسب نہیں حقیقت کے برخلاف ہے۔ مگر اقبال فرطِ عقیدت میں ان تہذیبوں کی موجودگی کے انکار کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ اس نظم میں پہاڑ، دریا، پرندے، انسان، مذہب اور عظمتِ لازوال کا اعتراف بڑے نکات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

فکرِ اقبال میں ہندوستان کی عزت وحرمت کو دوسرے زاویوں سے بھی پیش کیا گیا ہے جس کے تجزیہ کی ضرورت ہے۔ یہی سرزمین ہے جس نے اپنے فکر وفلسفہ کی بلندی میں یونان کو پیچھے چھوڑا۔ تمام عالم کو علم وہنر سے روشن کیا۔ جس کی خاک میں زر وجواہر رولتے ہوں۔ جہاں کا ہر باشندہ مثلِ کلیم ہے۔ جہاں کا ہر پہاڑ طور وسینا کی طرح جلوہ گاہِ ربِ ارنی ہے۔ اس کی تعظیم وتکریم میں جان ودل قربان ہے۔ اس نظم کا آخری شعر حاصلِ نظم ہی نہیں ترانۂ عظمت کی آخری نوشت ہے۔

رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے کے لیے ہندوستان کے ذرے ذرے معاون ومددگار ہیں اور یہاں کی آب وہوا میں زندگی گزارنا رشکِ جنت سے کم نہیں ہے۔ یہی میرا وطن ہے جو تمام نعمتوں کا گہوارہ اور دنیا بھر کی آسایشوں کا مرکز ہے۔ یہاں کے ہر ذرہ میں سرودِ ربّانی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ گویا یہاں کا ہر ذرۂ زمیں قابلِ صد پرستش ہے اور ستائش بھی۔ ان سے بڑی بات تو وہم وخیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ یہ ابتدائی دور کے انکشافات تھے اور اقرار نامہ۔ شاید کسی کو یہ تاویل تسلیم کرنے میں

تامل ہو۔اب آیئے زندگی کے دوسرے ادوار کا بھی جائزہ لے لیں۔

اقبال فلسفی شاعر تھے ان کی اپنی انفرادی فکر ہے۔جس کا وہ کثرت سے اعلان کرتے رہے ہیں ۱۹۱۵ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا۔جو ان کے افکار کا آغاز ہے ۔اسرارِ خودی کے مقدمے میں سری کرشن، گیتا، شنکراچاریہ کی خدمات کا اعتراف کرنے کے بعد مثنوی میں گنگا و ہمالہ کا مکالمہ بہت ہی دل چسپ حصہ ہے۔ان علامتوں کے وسیلے سے اقبال نے ہندوستان کو حیرت انگیز خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔یہاں کے برہمنوں کی تعریف جس انداز میں کی ہے وہ بھی بے مثل و بے نظیر ہے۔

بہرۂ وافر زحکمت داشتے　　با خدا جویاں ارادت داشتے
ذہن او گیر اؤ ندرت کوش بود　　با ثریا عقل او ہم دوش بود

ارضِ کشمیر کے خوب صورت منظر کو اقبال نے جس طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔عظمت کا یہ اعتراف اقبال کی انفرادیت ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ مالکِ کون ومکاں بہشت بریں میں قیام فرما ہے۔ایسا ہرگز نہیں ہے۔وہ یہاں کے لالہ وگل اور کوہسار کی وادیوں میں بسیرا کرتا ہے۔

تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را
نہاد است در دامن کوہسارے

ان کے بعد اقبال کی دوسری اہم فکری تخلیق جاوید نامہ ہے۔جس میں ایک دو نہیں بلکہ دسیوں مناظر اور مقام ایسے ہیں جو ہندوستان کی بڑائی اور بلندی کے ترانوں سے معمور ہیں۔وہ نغمے جو تخلیقی معجزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔اقبال نے ملک کے معروف سنسکرت شاعر کی عظمت کے اعتراف میں صرف ایک مصرع ہی دیکھیے جس میں مدح سرائی کی پوری روح سمٹ گئی ہے۔یہ وہ مصرع ہے جو ہماری علمی وادبی دنیا کا محاورہ نہیں ضرب المثل بن گیا ہے۔

شبنم از فیضِ نگاہِ تو گہر

عظمت کا یہ اظہار بھرتری ہری کو آج تک کسی کی زبان سے نہیں ملا۔فلکِ قمر پر

طاسین گوتم ہے۔اقبال نے اپنی فکری ارجمندی کا اظہار اس تعلق سے جس خیال افروزی سے کیا ہے۔وہ بھی بے مثل ہے:

پیشِ صاحب نظراں حور و جناں چیزے نیست

اقبال نے اسی فلک پر عارفِ ہندی کی عظمتوں کا قندیل روشن کیا ہے انہوں نے نوفکر انگیز نکات بیان کر کے زندگی کے اسرار کو فروزاں کیا ہے۔گویا نو نکات رازِ درون کائنات کے مظہر ہیں۔اس تخلیق میں وہ لافانی قول بھی موجود ہے

برتر از گردوں مقامِ آدم است

اصل تہذیب احترامِ آدم است

گویا ہندوستان تفکیری طور پر نوعِ بشر کی عظمت کا رجز خواں ہے۔فلسفہ وفکر کے اس عظیم تصور کی نگہداری برصغیر کی وراثت ہی نہیں اس کے دستورِ زندگی کا جلی عنوان ہے۔ یہ احترامِ آدم کے آئین پر پابند اور اس کی علامت ہے۔اقبال نے اپنے فکری تصورات کی آفاقی عظمت کو ہندوستان سے منسوب کر کے قلب ونظر کی فراخی اور کشادگی کی مثال قائم کی ہے۔عارفِ ہند کے وسیلے سے یہ نکات بیان کیے گئے ہیں۔ان نکات سے اقبال کی فلسفیانہ فکر ہی نہیں ان کی برگزیدہ شخصیت کی جاوداں دل کشی بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔

فلک زحل پر ''روح ہند'' کو زندہ پیکر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔اس پیکر کی صفات کے ذکر میں فکرِ اقبال نے ندرت پیدا کی ہے کہ اس کی پیشانی پر نور و نار کی ابدی نشانیاں جھلک رہی ہیں اور اس کی آنکھوں سے لازوال سرور چھلک رہا ہے۔جو مانند ابرِ سحاب اور برگِ گلاب ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ افسوس اور ہزار افسوس ہے کہ اہلِ ہند اس سرزمین کے شان وشکوہ سے بے گانہ ہیں۔

ہندیاں بے گانہ از ناموسِ ہند

فکر اقبال میں یہ احساس خلش کی صورت رکھتا ہے کہ یہاں کے باشندے ناموسِ ہند سے نابلد ہیں۔ان کی یہ خلش کہیں کہیں نالۂ دل دوز بن کر نمودار ہوتی ہے۔ اب ذرا ایک آخری تخلیق کا جائزہ لے لیجئے۔'ضربِ کلیم' کی نظم 'شعاعِ امید' ۱۹۳۶ء کی

تخلیق ہے گویا انتقال سے دوسال پہلے لکھی گئی۔فنی اور شعری خوبیوں سے یہ نظم مالا مال ہے ۔جس کی ہر نقاد نے تعریف کی ہے۔فکری سطح پر بھی یہ نظم ایک اعلیٰ پایہ کی شاہکار ہے۔اس نظم میں اقبال نے ترانۂ عظمتِ ہند کا جو تصور پیش کیا ہے وہ فکرِ اقبال کی شناخت ہی نہیں پورے سرمایۂ تخلیق کی روح بن گئی ہے۔

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن　　یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درِ باب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی　　جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

غرض اقبال کے اردو فارسی کلام میں ہندوستان اور اس کے متعلقات سے ایک جذباتی تعلق خاطر کی بہت ہی واضح اور وافر مثالیں ملتی ہیں۔اور یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے کہ وہ ہر دور میں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ زندگی کے کسی دور میں ارضِ ہند کے معاملات ومسائل سے بے گانہ نہیں رہے۔بسترِ علالت پر بھی ان کا انہماک اور دل چسپیاں برقرار تھیں۔وہ ہمالہ کی طرح ہندوستان کے جلال و جمال کے حدی خواں رہے۔ بلکہ یہاں کے باشندوں کو یاد دلاتے رہے کہ خاکِ ہند کی بزرگی و برنائی سے اپنے دلوں کو روشن رکھو۔کیوں کہ یہی احساس ملک کی غلامی کے خلاف جوش وخروش اور ایثار وانقلاب کو آواز دے گا اور ملک کی عظمت وسالمیت کی حفاظت کرے گا۔

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

ہماری بدبختی سے یہ سرزمین غیروں کے حرص وہوس کی شکار ہے۔ملک ہمارا اور حکمرانی غیروں کی کیسے گوارا ہوسکتی ہے۔اقبال نے اضطرابِ قلب کے ساتھ ملک کو غیروں کی غلامی سے آزاد کرانے کی تدبیروں میں غرق ہوتے ہیں یہ ان کے فکر وشعر کا ایک محرک جذبہ بن کر ابھرتا ہے۔

اقبال کی شاعری کے دو ایسے منفرد پہلو ہیں جس کی نظیر عالمی ادب میں شاید ہی ملے ان کا کلام عصری واقعات اور حادثات کا جامِ جہاں نما ہے جس میں رنج وراحت کے کئی پہلو بہت نمایاں ہیں ۔ دوسری انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے شعر وتخلیق کو عالمی

معاملات ومسائل کی آ گہی بخشی ۔اردو آفاقی وسعتوں سے ہم کنار ہوئی جبکہ ملک کے دوسرے ادب محدود تصورات میں بند رہے ۔ان کی تخلیقات میں تیرہ سو سے زائد آثار واسماء واماکن کے حوالے ہیں ۔ایشیائی ملک وملت کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک کے نام بھی کلام میں موجود ہیں ۔جیسے امریکہ،اندلس،انگلستان،جاپان،جرمنی،فرانس،مصر، ولایت ، ہسپانیہ، یورپ ،یونان وغیرہ کے ساتھ متعدد شہروں ومقامات کے ساتھ شعراء ،سیاست دانوں ،مفکرین ومصلحین کے نام درج ہیں ۔ان ملکوں اور شہروں کی تاریخ وتحریک نیز عصری کوائف پر اقبال کی نظر ہمیں حیرت میں مبتلا کرتی ہے۔ان کے بیانات کا یہ عالمی منظر نامہ بھی ان کی بصیرت کے یقین کے لیے کافی ہے۔یہ ان کی وسعتِ نظر ہے کہ وہ پوری کائنات سے سروکار رکھتے ہیں۔یہ دوسری بات ہے کہ ان کے قلب ونظر کو اس برصغیر سے جو شیفتگی ہے وہ کسی دوسرے خطۂ ارض سے نہیں ہے۔یہ بدیہی بات ہے کہ اقبال اوران کے اسلاف کا مسکن ومدفن ہونے کے ساتھ ان کے تاریخ وتہذیب کا عروج وزوال بھی اسی خاک وخمیر سے وابستہ رہا ہے۔

براعظم کی بیداری کے نقیب کے لیے ناممکن تھا کہ وہ برصغیر سے بے نیاز ہوتے اور ہندوستان کے متعلقات سے بےخبر رہتے ۔یہ ملک اپنی وسعتوں اور درپیش مسائل کی پیچیدگیوں کے اعتبار سے ایشیائی مسائل سے کم نہ تھا بلکہ اس ملک کے مسائل سے براعظم براہِ راست جڑا ہوا تھا۔بہت سے ممالک کی طرح یہ بھی مغرب کی غلامی کے لیے مجبور تھا ۔استبداد اور استحصال میں بھی کمی نہ تھی دوسرے ممالک کے مقابلے میں اس کے حدود اور آبادی کے ساتھ مسائل زیادہ سنگین تھے انگریزی اقتدار کی ستم رانیاں بھی کم نہ تھیں۔یہاں کی غلامی اور بےبسی نے ہی اقبال کو بڑے تناظر میں سوچنے کے لیے مجبور کیا۔برصغیر کی بدحالی نے براعظم کی کسمپرسی کی طرف توجہ دلائی اور اقبال کے شعور کو عالمی زاویۂ نگاہ بخشا بالفاظِ دیگر سفالِ ہند کے چھوٹے سے پیمانے میں شامل تھوڑی سی شراب نے رندِ کوراز گنبد مینا سمجھنے کا موقع دیا۔یہ نکتہ بھی پیش نگاہ رہے کہ اس دور کے بعض اکابرین کو بصیرت آفریں نظر حاصل تھی جو ہندوستان کی آزادی کے لیے ایشیائی ممالک کی آزادی کو لازم وملزوم

سمجھتے تھے۔ یہ ایک سیاسی اور دفاعی حکمت عملی تھی وہ جبل طارق کے چودہ کلومیٹر چوڑے آبی راستے اور ایک سونوے کلومیٹر سویز کی حاکمیت سے انگریزی حکومت کی شہ رگ کو کاٹنا چاہتے تھے۔ اس فکر کی دانائی سے بعض دانشوروں کو اتفاق نہ تھا۔ گاندھی جی کی خلافت تحریک کی حمایت کرنے پر خود ان کی جماعت کے کچھ لوگ معترض تھے۔ یہ حضرات جغرافیائی، دفاعی اور اقتصادی آگہی سے زیادہ باخبر نہ تھے۔ مگر اقبال کی دروں بینی شفاف آئینے کی طرح دیکھ رہی تھی۔ پنڈت نہرو کی گوا پر قبضے کی کامیابی میں جمال عبدالناصر کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، جس نے پرتگالی لشکر اور فوجی ساز و سامان سے لیس بحری جہازوں کو سویز نہر سے گزرنے نہیں دیا۔ اقبال کی حکیمانہ تخلیق کی معنویت کو اس سیاق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فکر و تدبر کے سلیقے کا تقاضا ہے کہ ان کے جہانِ معنی سے سرسری نہ گذرا جائے۔

اقبال نے بارہا تاکید کی ہے کہ انھیں صرف نوائے پریشاں کی شاعری کا ترجمان ہی نہ سمجھا جائے۔ وہ جہاں داری کے بھی محرم راز ہیں۔ اقبال نے ملکی اور بین الاقوامی صورتِ حال یا سیاسی کشاکشوں کے دل دوز تذکرے سے اردو کو روشناس کرایا اور شعری اظہار کو عالم گیر مسائل کا متحمل قرار دیا۔

ایک دوسرے زاویۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے اقتصادیات پر صرف پہلی کتاب ہی نہیں لکھی تھی بلکہ یہ مسئلہ ان کی فکر میں اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ ملک کی ابتر معاشی صورت حال سے اقبال باخبر تھے۔ ہندوستان کے معاشی استحصال پر ان کے فکر انگیز خیالات کو بھی اسی تحریک آزادی کے سیاق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ انگریز کی تاجرانہ عیاری سے یہاں کے تخت و تاج کے مالک بنے تھے:

تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج
از تجارت نفع و از شاہی خراج

قالی از ابریشم تو ساختند
باز او را پیش تو انداختند

اس معاشی استحصال سے کشت دہقاناں خراب ہے۔کشت وکسان ہو یا خرمن و خوشۂ گندم اقبال نے بڑی پرسوز انقلابی اور باغیانہ آوازیں بلند کی ہیں:

اس کے آب لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا ہے

اقبال ہر دور میں ہندوستان کا اکرام واحترام کرتے رہے اور بھولے سے بھی وہ کبھی غافل نہ ہوئے۔ یہاں کے ذروں سے قلبی وابستگی فکری عقیدت کی حد تک پہنچ چکی تھی۔۱۹۰۴ء میں 'سارے جہاں سے اچھا' اور 'خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے' کہنے والے اقبال ہیں۔ پھر۱۹۳۲ء میں 'جاوید نامہ' میں رودِ کاویری کو جو خراج پیش کیا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ سرزمینِ ہند سے ایسی والہانہ محبت کرنے والا تاریخ ادبیات میں ناپید ہے:

ہندوستان کی بدحالی اور باشندوں کی بے حسی کا سب سے الم ناک منظر ملاحظہ کرنا ہو تو 'جاوید نامہ' کے فلک زحل سے رجوع کیجیے۔ ملک سے غداری کرنے والوں کے ذکر سے ہی اس سیاحت کی شروعات ہوتی ہے۔ ارواحِ رذیلہ کا ذکر ہے جنھیں دوزخ نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ غدارانِ قوم کا یہ نفرت نامہ ہے، جو ہماری شعری روایات میں پہلی بار منظر پر آیا۔ روح ہند کے ہونٹوں پر مسلسل نالہ ہائے دردمند کی صدائیں کراہ رہی ہیں:

گفت رومی روح ہند است ایں نگر
جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم ننگِ دیں ننگ وطن
ملّتے را ہر کجا غارت گرے است

اصل او از صادقے یا جعفرے است
الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں

آخری تخلیق 'ارمغان حجاز' میں ہندوستان کا ذکر ہوتا رہا، اس ملک کی آزادی میں دوسرے ایشیائی ممالک سے غلامی کے خاتمے کا اعلان موجود تھا۔ تاریخ نے ثابت بھی کر دیا کہ برصغیر کے آزاد ہوتے ہی کئی ملکوں میں صبح درخشاں کا آفتاب طلوع ہوا۔ بڑے سے بڑا ملک چین ہو یا چھوٹے سے چھوٹا سری لنکا، سب ۱۹۴۷ء کے معاً بعد آزاد ہوئے۔ اقبال کی بصیرت بہت پہلے بتا چکی تھی کہ ہندوستان ہی ایشیائی ممالک کے مقدر کی سرنوشت لکھنے میں پہل کرے گا۔ دوسرے اکابرین کی فکری بصیرتوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ جمال الدین افغانی، مولانا شبلی، مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی، مولانا آزاد وغیرہ کی نظروں میں یہ نکتہ رازِ درونِ فکر بن کر پرورش پاتا رہا۔ اس خطۂ زمین کی خوش حالی دوسرے تمام ملکوں کی آزادی کے بغیر ممکن نہ تھی۔ فکر و فلسفہ کی سطح پر بھی اقبال کی نظر آفاقی وسعتوں پر محیط تھی اور کائناتی انسان ہی ان کا محور تھا۔ وہ 'جاوید نامہ' میں آفتاب کے استعارے سے اپنی انتہائی فکر انگیز بات کہہ چکے تھے کہ گرچہ سورج یورپ سے نکلتا ہے مگر پوری کائنات کو روشن کرتا ہے۔ ہر انسان بھی مثلِ آفتاب ہے۔ اس کی نسبت جائے پیدائش سے ضرور ہے مگر اس کی نگاہ میں ارض و سما کی پہنائیاں ہوتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک غلامی کے خلاف بغاوت کے لیے تین راستے بھی تھے۔ سب سے پہلے وطن عزیز سے بے پناہ محبت کا جذبہ پیدا کرنا۔ دوسری سطح پر تمام قوموں کے درمیان مضبوط رشتہ اتحاد کا قائم ہونا سارے جہاں سے اچھا سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں۔ اور پھر انگریزی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا۔ تحریک آزادی کے یہی تین ارکان تھے، جن سے اقبال کی شاعری معمور ہے۔

اقبال کی نشو و نمائے فکر تحریک آزادی کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ عمر کے پچیس سال گزرے تھے کہ سیاسی فکر پختگی کی دہلیز پر دستک دینے لگی۔ ۱۹۰۴ء کے اشعار آج بھی

ہماری ہر تحریک و تنبیہ کا محاورۂ روز و شب ہیں اور سچ یہ ہے کہ اس وقت تک کسی بھی زبان یا ادب میں ہندوستانیوں کے لیے یہ تخاطب یا تاکیدی کلمات نہیں ملتے۔ اس میں آگہی اور پیامبری کے ساتھ جاں سوز انجام کے خلاف شمشیر بدست ہو کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننے کی آرزو بھی شامل ہے۔ شعری زبان میں اسے سب سے پہلی انقلابی آواز اور فرمانِ آزادی کا اعلانیہ کہنا چاہیے:

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

یہ غیر معمولی دردمندی کا اظہار تھا جو اردو شاعری کے توسط سے ہندوستانی سیاست کا نقیب آزادی بن کر نمودار ہوا۔ اس سے قبل ایسی آواز ہماری سماعتوں میں نہ تھی۔ غلامی کے خلاف باغیانہ احتجاج کا یہ آغاز تھا۔ جو آزادی کا صور پھونکنے میں آتشِ فروزاں کا کام دے رہا تھا۔ ابھی آزادی کے خدوخال ابھرنے میں تاخیر تھی اور شاعر کی بصیرت دیکھیے کہ ۱۹۰۴ء میں ہی باشندوں کی بے ضمیری کو للکار رہا ہے۔ حمیت و عزیمت کو نفسِ گرم سے آشنا کرنے میں اقبال نے جو حق ادا کیا وہ سیاسی بساط پر بھی ابھی تک نمودار نہ ہو سکا تھا۔ آزادی کی علم بردار جماعت نیشنل کانگریس بھی کوئی ایسا نعرہ نہ دے سکی تھی:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں، تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں اور عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں، لذت فریاد پیدا کر، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں، جیسی باغیانہ اور غیرت کو للکارنے والی آوازیں اقبال سے ہی منسوب کی جائیں گی۔ اردو کیا ملک کی تمام لسانی تخلیقات میں باغیانہ لہجے کی یہ شاعری نظر نہیں آتی۔ اس ابتدائی نظم میں تینوں زاویے موجود ہیں۔ یعنی ہندوستان کی عظمت کا اعتراف، انگریزی حکمرانی کے خلاف بغاوت اور باشندگانِ ہند کے مابین محبت و اخوت کا پیغام۔ نظم کے اختتامی دو اشعار

ملاحظہ ہوں:

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے گے

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

جس طرح اقبال اٹھ کھڑے ہونے کی بار بار تاکید کرتے ہیں وہ کہیں نہیں ملتا

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

دل و جاں کی قربانی اور سپردگی کا یہ پیغام غلامی کے خلاف صدائے دردناک تھی، جو رحیلِ کارواں کے لیے ضروری تھی۔ اقبال کی شاعری میں 'ستیزی' اور 'رستاخیزی' کے الفاظ کے محل استعمال اور معنویت پر غور کیجیے تو یقین آئے گا کہ وہ پوری قوم کے کمر بستہ ہونے کے لیے مضطرب ہیں اور ان لفظوں کو چن چن کر استعمال کرتے ہیں جن میں جگر تابی اور جاں سوزی کے مفاہیم موجود ہیں۔ وہ بیداری کے پہلے نقیب ہیں، جنھوں نے صدیوں کی خواب آوری اور ناکردہ کاری کے خلاف بغاوت برپا کی۔ ان ترانوں کو دیکھیے جن میں للکارنے اور لائحہ عمل کو متعین کرنے کی تڑپ موجود ہے۔ پوری شاعری میں یہ پہلی آواز تھی: خواب سے جاگو، اٹھو، تیار ہو، چلو اور پھونک ڈالو، برہم کر دو، لہو گرم کرو، خونی کفن پہنو، تیشہ و تبر سے کام لو، شمشیر و سناں باندھو، مردانہ وار نہیں جی سکتے تو موت کو مردانگی سے قبول کرو جیسے شور انگیز خطابات ان کی شاعری میں ہی دستیاب ہیں۔ ان لفظوں کو دیکھیے جو

قیامت خیز طوفان برپا کرنے والی شاہ کار تخلیق ہیں:

از گرمیِ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
ازخوابِ گراں،خواب گراں،خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز!

خیز، برخیز، رستاخیز، برانگیز، برفشاں، پیہم دواں، ہردم جواں، ہشیار، بیدار، بے قرار جیسے سیکڑوں الفاظ صرف شعری تلازمے نہیں ہیں بلکہ اقبال کی انقلابی فکر اور احتجاجی اظہار کے ترجمان ہیں، جو آزادی کے فراواں احساس اور استحضار کی علامت ہیں۔

آخری بند میں انگریزی جابریت کے خلاف جنگ جوئی کو عمرِ رواں کا حاصل قرار دیا گیا ہے۔اس آمریت کے خاتمے کے لیے بیدار بختی کی بشارت بھی دی گئی ہے:

فریاد ز افرنگ و دلآویزیِ افرنگ
فریاد ز شیرنی و پرویزیِ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیِ افرنگ
معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز!
ازخواب گراں،خواب گراں،خواب گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!

اسی 'زبورعجم' کی دوسری تخلیق میں 'انقلاب' کے لفظ کو پہلی بار پراسرار معنویت دی گئی۔ انقلاب ہو یا احتجاج، اعتراض ہو یا انتظام، شاعری ہو یا سرکشی، بغاوت ہو یا خطابت سب اقبال کے دیے ہوئے نعرۂ انقلاب کے مرہونِ منت ہیں:

جانِ محکوماں ز تن بردند و محکوماں بخواب
انقلاب!

انقلاب اے انقلاب!

کیسی پتے کی بات کہی ہے کہ فریب دے کر میر وسلطان نے ہندی غلاموں کے جسم سے روح غصب کر لی ہے اور محکوم محوِ خواب ہے۔ انقلاب کو آواز دو کہ شورشِ سلاسل برپا ہو۔ نو بندکی اس نظم میں نظامِ حکومت کو دَرہم کرنے کا پیغام ہے۔

اقبال نے ۱۹۰۷ء میں ہی یہ شور انگیز پیغام سرزمین یورپ سے سنایا تھا۔ مغربی تہذیب کے خلاف کسی ہندوستانی کی یہ پہلی آواز تھی جو بانگِ درا اور بانگِ رحیل بن کر نمودار ہوئی تھی:

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائدار ہوگا

اقبال ابھی اسپنگلر کی کتاب 'زوالِ مغرب' سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۰۷ء کی یہ احتجاجی آواز چالیس سال بعد اذانِ آزادی ثابت ہوئی۔ اقبال کی آرزو تھی کہ اگر وہ صبحِ آزادی کا نغمۂ نو بہار نہ بن سکیں تو کم سے کم سوزِ اقبال کو یہ توفیق ملے کہ بہار سے پہلے آنے والے پرندوں کی طرح آزادی کی خبر دے سکیں۔ ان کی دعا مستجاب ہوئی۔

خلافت تحریک زوروں پر تھی۔ ملک کا ہر پیر و جواں خلافت پر جان دینے کے لیے آمادۂ پیکار تھا۔ اقبال کیسے خاموش رہ سکتے تھے؟ انھیں دریوزہ گری سے نفرت تھی۔ ان کا قول سنیے:

خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

ان مصرعوں میں ایک آسمانی آواز شامل تھی۔ اس کے مخاطب بھی ہندوستانی ہی

تھے، جن کے خاکستر کی چنگاری سے مشرقی ممالک میں صورِ اسرافیل سنی جارہی تھی۔ اب سرمایہ دار اور مزدور کی کشاکش بھی شامل ہوگئی۔ کیوں کہ تلاطم ہائے دریا سے ہی گوہر کی سیرابی ممکن ہے۔ تبھی کبوتر کے تنِ نازک میں شاہینی جگر پیدا ہوگا اور فرنگی مدنیت کا خاتمہ ہوگا، کیونکہ:

تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

انھیں انجام تک پہنچانا بھی ہے۔ محکوم قوم کا لہو گرم ہو چکا ہے جس سے جہانِ چار سو کانپ رہا ہے۔ اب سرمایہ داری یعنی انگریزی سامراج کا نظام ختم ہونے کو ہے اور اقبال ان کے سفینے کے ڈوبنے کے منتظر ہیں۔ زمین و آسماں کو خاکستر بنا دینے کا عزم اقبال دیتے ہیں۔

ان بیانات کے بعد یقین کے ساتھ باور کرنا چاہیے کہ برصغیر کی بیداری و آزادی کی جدوجہد میں ان کے انقلاب آفریں پیغام کی صدائے بازگشت ہر سو سنائی دیتی ہے۔ شاید ہم ابھی تک ان آوازوں کی سماعت کے متحمل نہیں ہو سکے ہیں یا اقبال کے فروغِ فکر کی تجلیات تک رسائی میں ہماری دانش و بینش کے پر جلتے ہیں۔ یا ہم بے بنیاد توہمات میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ہم برملا اقرار و اعتراف کریں یا نہ کریں درونِ دل اقبال کی ان آوازوں کے مؤثرات سے متاثر اور معترف ہیں۔ پس از مرگ بھی ان کی لحد اہل عزم و ہمت کے لیے زیارت گاہ ہے۔ انھوں نے خاک نشینوں کو اسرار سلطانی اور رازِ الوندی سکھائے ہیں۔ یہ عرفان بھی توجہ طلب ہے کہ اگر وہ چہرۂ افکار کے دبیز پردوں کو چاک کر دیں تو ان نواؤں کی تاب و تپش اہلِ فرنگ کیلیے نا قابل برداشت ہوگی۔ کیوں کہ:

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا

یا

لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

فرنگ سے اس حد تک خطاب کہیں نہیں ملے گا۔

اقبال پہلے شاعر ہیں جو عملی سیاست میں بھی شریک ہوئے۔ پنجاب لجسلیٹو کونسل

کے انتخاب اور ۱۹۳۱ء کو گول میز کانفرنس میں 'گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الامان' کا مشاہدہ کر چکے تھے۔

یہ ایک عمومی تذکرہ ہے جس میں عہدِ اقبال کی سیاسی صورتِ حال اور اقبال کے فکری ردِعمل کے ساتھ ان کی پیامبرانہ شاعری پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ اقبال نے محکوم اقوام کے استحصال کے خلاف جس شدت سے نفرت کا اظہار کیا اور انھیں جنگ کے لیے آمادہ کیا، اس کی مثال برصغیر ہی نہیں بلکہ کرۂ ارض پیش کرنے سے قاصر رہی ہے۔ اقبال اس حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ وہ پیش گوئی کے قائل نہ تھے لیکن ان کی بصیرتوں میں وجدان والہام کے مشاہدات اور کرشمہ سازِ فکر کسی طرح کم نہ تھی:

مرے گلو میں ہے اک نغمۂ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لیے

اقبال نے اپنے جس جہاں آشوب نغمے کو لامکاں کے لیے سنبھال کر رکھا تھا اسے انتہائی دردمندی سے براعظم کی بیداری کے قافلے میں لٹا دیا۔ ان کی بصیرت انجم شناسی کو مات دے کر تاروں کی گردش تیز کرنے کے ساتھ دلِ ہر ذرہ کو رست خیزی کے لیے سامانِ سفر فراہم کر گئی۔ آئندہ بیداری بخشنے والی آوازیں اقبال سے ہی منسوب کی جائیں گی:

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق
باز روشن می شود ایامِ شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید

دنیا نے دیکھا کہ اقبال کا جہان آشوب نغمۂ بشارت بھری آواز بن کر حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔ اقبال نے آزادی کے خواب کو شفاف حقیقت سمجھ کر لکھا تھا۔

دیکھ رہا ہے یہ کسی اور زمانے کا خوابم

اقبال اور امیر مینائی

اقبال نے فکر و دانش کے صاحبانِ نظر کے علاوہ شعر و ادب کے بیش از بیش قلم کاروں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کا وسعتِ مطالعہ ہماری حیرت فزائی میں اضافہ کرتا ہے۔ انہوں نے دردِ دل کی پوری کشادگی کے ساتھ اپنے اکتسابات کا جگہ جگہ اظہار بھی کیا ہے۔ ان کے مصدرِ فکر کے قابلِ فخر سرچشمے آخری صحفِ سماوی اور حضور رسالت مآبؐ کی ذات گرامی ہیں۔ رموز بے خودی کے اختتامیے میں قرآن حکیم کو کتابِ زندہ، لازوال حکمت و دانائی کا سرچشمہ، تکوینِ حیات کا نسخۂ اسرار کہتے ہوئے اقرار کرتے ہیں کہ میں نے اسرار قرآں کے موتی پروئے ہیں

گر دُرِ اسرارِ قراں سفتہ ام

تنزیل وحی کے حامل صاحبِ کتاب سے متعلق اقبال کا یہ اعتراف ان کے مطالعہ میں نقطۂ نور ہے۔

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

یعنی فکر و نظر کا تمام سرمایہ اسی ذاتِ گرامیؐ کی بے پایان بخشش کا ثمر اور اسی کے احسان کا پروردہ ہے۔

مولانا رومی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مرشدِ روشن ضمیر ہیں جنہوں نے میری

خاک کو اکسیر بنایا ہے۔مولانا جامی کو نذرانہ پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے:

کشتۂ اندازِ ملا جامیم
نظم ونثر او علاجِ خامیم [۱]

شعریاتِ اقبال میں قابلِ ذکر خراجِ تحسین نظیری نیشاپوری کو پیش کیا گیا ہے۔ اسے دو بار تضمین کیا گیا ہے۔کیوں کہ اقبال کی فکری فضاؤں میں نظیری کا قول طلوعِ نور کی مانند ہے۔نظیری کی طرح اقبال اپنے قبیلے میں اسی شخص کو شامل کرنا چاہتے ہیں جو شوقِ شہادت کو لبیک کہنے کے لیے تیار ہو۔

بملکِ جم ندہم مصرعِ نظیری را
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ مانیست [۲]

کلامِ اقبال میں کثرت سے بے فارسی سخن وروں کے حوالے ملتے ہیں۔مگر اردو شعرا کے بارے میں یہ صورت نہیں ہے۔غالب پر نظم کے علاوہ جاوید نامہ میں قابلِ ذکر تذکرہ ہے۔ان کے کئی اشعار بھی حوالے میں آتے ہیں۔حالی وشبلی اور داغ کی رحلت پر نظمیں موجود ہیں۔محمد حسین آزاد کا بھی ایک حوالہ ڈائری میں ملتا ہے۔ان کے علاوہ امیر مینائی کا کئی بار ذکر کیا گیا ہے۔انہیں اشعار کی بنیاد پر پیشِ نظر مضمون سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ مرثیۂ داغ کے علاوہ استاد کے بھی اتنے حوالے نہیں ملتے۔متروک غزل کے ایک مطلع میں مذکور ہے:

گر ہم پر خفا ہوتا ہے جو وہ بت اقبال
حضرتِ داغ کے اشعار سنا دیتے ہیں [۳]

مگر امیر کا معاملہ برعکس ہے۔کئی جگہ اشارے موجود ہیں۔اصلاحِ سخن کے لیے اقبال کی داغ سے بہت مختصر مراسلت ہوئی۔دو تین غزلوں کے علاوہ داغ کا رنگِ سخن غالب نہ آسکا۔ان کا طرزِ کلام اقبال کے مزاج کے منافی تھا۔داغ کے آہنگ پر ٹھہر جانا کسی ہلاکت سے کم بھی نہ تھا۔

امیر داغ کے معاصر اور معترف تھے۔ دونوں کی کارگہی کے میدان مختلف تھے۔ ارضی مملکت میں فضائی فاصلہ بھی حائل تھا۔ رام پور لاہور سے قریب تر ہونے کی وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ شاید اقبال نے امیر مینائی سے بھی رجوع کیا ہو۔ کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ مگر حوالے امیر سے وابستگی کا اشارہ کرتے ہیں۔ اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے گوشۂ دل میں امیر کا احترام موجود ہے۔ داغ کے انتقال پر لکھی جانے والی نظم میں امیر کا تذکرہ بے سبب نہیں ہے۔ یہ نظم کا دوسرا شعر ہے۔

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیؔر
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیؔر

نظم میں غالب، مہدی مجروح اور حالی کے ساتھ کیفِ صہبائے امیؔر کا تذکرہ اقبال کے نہاں خانۂ دل کی نسبتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اقبال نے اپنی محبوب شخصیتوں کی رحلت پر قطعۂ تاریخ بھی قلم بند کیے ہیں جیسے سرسید وغیرہ۔ ۱۷ر نومبر ۱۹۰۰ء میں امیر مینائی کا انتقال ہوا۔ اقبال نے تاریخ کہی۔

لسان الصدق فی الاخرین

امیر سے اقبال کے تعلقِ خاطر کا ایک اور سراغ ملتا ہے اقبال نے مولانا احسن مارہروی کو ۱۹۰۳ء میں جو خط لکھا تھا اس میں امیر مینائی کی تصویر طلب کی تھی غالباً یہ اقبال کا سب سے پرانا خط ہے جو اقبالنامے میں نقل کیا گیا ہے۔ اس سے اقبال کے شوق دید و دریافت کا پتہ چلتا ہے۔ قدرت نے اقبال کو شعری بیان کے لیے بلا کی قوت بخشی تھی۔ ان کی نظمیں ان کے بیانیہ اظہار کی بہترین مثالیں ہیں جن میں داستان سرائی کے بھرپور عناصر موجود ہیں ان کی مختصر اور طویل نظمیں فنی معجز نمائی کی شاہد ہیں۔[۴] ابتدائی دور کی ایک نظم ''سرگذشتِ آدم'' بانگِ درا کے حصۂ اول میں شامل ہے۔ یہ نظم ۱۹۰۴ء کی تخلیق ہے اور اٹھارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں حضرتِ آدم کی ریاضِ جنت سے لے کر کرۂ ارض کو غیرتِ بہشت بریں بنا دینے تک کی لاکھوں برس کی داستان کو بیان کیا گیا ہے۔

رسالہ مخزن ر ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں یہ نظم پہلی بار شائع ہوئی تھی اس میں ۲۸

اشعار تھے۔ بانگِ درا کی اشاعت کے وقت اس نظم کے دس اشعار حذف کر دیئے تھے حالانکہ یہ اشعار فنی اور فکری اعتبار سے اہم تھے۔ اس نظم کا مقطع بھی متروک کر دیا گیا۔ وہ حسبِ ذیل ہے:

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیؔر اقبال
میں بت پرست ہوں رکھ دی یہیں جبیں میں نے [۵]

امیؔر سے عقیدت مندی کا یہ اظہار ان سے وابستگی کی دلیل ہے اور رشتہ و پیوند کا پتہ دیتی ہے۔ اس نظم کی اشاعت پر حکیم برہم گورکھپوری نے اپنے رسالہ 'فتنہ' میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر اقبال نواب مرزا داغ سے فیضیاب ہیں تو دوسری طرف امیر مینائی سے بھی مستفید ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اقبال کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ یہ دعویٰ کر سکیں کہ پنجاب کی اردو شاعری کو انہوں نے غیر مانوس اور غیر فصیح الفاظ سے پاک وصاف کر کے ایک رنگ اپنے لیے اختیار کر لیا۔ اگر زبان کی صفائی میں وہ جناب مرزا داغؔ کے پیروکار ہیں تو خیالاتِ عالیہ اور مضامینِ بلند اور جدت طرازی میں جناب امیؔر کے مینائے کلام کے جرعہ کش ہیں۔''[۶]

چوں کہ حکیم برہمؔ کا سلسلہ امیر مینائی سے ملتا ہے۔ اس لیے بھی عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے ابھی تک اس کا سراغ نہیں مل سکا ہے کہ اقبال نے امیر مینائی سے بھی براہِ راست استفادہ کیا ہے یا ان سے اصلاح لی ہے۔ داغؔ حیدرآباد میں تھے۔ اقبال خط وکتابت کے ذریعہ اصلاح لیتے رہے۔ اگرچہ یہ اصلاح برائے نام تھی۔

امیر کی شخصیت اور شعر سے شعوری قربتوں کے دوسرے شواہد بھی ملتے ہیں۔ اقبال کی مقبولیت سے ان کے حریف وحلیف حلقے میں اضافہ ہوا۔ اہل لکھنؤ نے علاقائی عصبیت اور زبان دانی کے زعم میں اقبال کے زبان و بیان پر اعتراضات کیے اقبال نے

ان کے جواب میں ''اردو زبان پنجاب میں'' کے عنوان سے عالمانہ مضمون لکھا اور اساتذۂ فن کے کلام سے مثالیں دیں۔ ان میں امیر کے کئی اشعار بہ طور سند پیش کیے گئے ہیں ۔اعتراض کے پہلے جواب میں اقبال نے امیر کے دو شعر کا انتخاب کیا ہے۔

''اساتذہ کا کلام میرا موید ہے۔فخر المتقدمین والمتاخرین حضرت امیر علیہ الغفران ایک مشہور غزل میں فرماتے ہیں:

صورتِ غنچہ کہاں تاب ِ تکلم مجھ کو
منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو
مر کے راحت تو ملی پر ہے یہ کھٹکا باقی
آ کے عیسیٰ سرِ بالیں نہ کہیں قم مجھ کو

دوسرے شعر میں ''کہنا'' کا مقولہ ایک مرکب تام یعنی قم ہے۔اور حضرتِ مرحوم اس کا صلہ ''کو'' استعمال کرتے ہیں۔''[۷]

اعتراض دوم کے جواب میں بھی امیر کا حوالہ ہے۔حضرتِ امیر مرحوم روحی فداہ کا بھی ایک شعر یاد آ گیا۔

قاصد! یہ زباں اس کی بیاں اس کا نہیں ہے
دھوکا ہے تجھے اس نے کہا اور ہی کچھ ہے''[۸]

تنقید ہم درد'' کے چوتھے اعتراض کے جواب میں اقبال نے امیر مینائی ہی کے شعر سے بارِ ثبوت فراہم کیا ہے۔

سنگ دل تجھ کو مرے ساتھ یہ کاوش کب تک
میری سوزش کے لیے غیر سے سازش کب تک

[۹]

اعتراض ششم کے جواب میں بھی امیر کا مصرع منقول ہے۔

میں بارِ خاطرِ قفس و آشیاں نہیں [۱۰]

یہ مضمون مخزن میں ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔ جب اقبال چوبیس برس کے تھے

۔ان کے تجرِ علمی اور بے کراں مطالعہ کے اعتراف کے لیے یہ مضمون سند کی حیثیت رکھتا ہے۔سترہ صفحے پر مشتمل مضمون میں تقریباً ۶۰ بار شعراء کے اسما و اشعار کا اعادہ کیا گیا ہے۔ امیر کے اشعار کے حوالوں کی تکرار سے اقبال کی پسندیدگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مطالعۂ اقبال میں یہ بات اہم ہے کہ شعوری قربتوں اور چاہتوں کے باوجود اگر اقبال کی فکر سے کہیں تصادم یا انحراف نظر آتا ہے تو وہ معترض ہوتے ہیں۔اور تنقید کرتے ہیں۔اس ضمن میں حافظ شیرازی کی نمایاں مثال ہے۔ بیدل کے ایک شعر پر تنقید موجود ہے۔مومن کی شاعری پر بھی انہیں اعتراض ہے۔غالب پر ان کی تنقید اسی فکری رویے کا نتیجہ ہے۔ایک شعر میں موجود امیر مینائی سے عقیدت و محبت کے باوجود ان کے فکر و خیال کو ناپسند کیا ہے۔مگر اس شعر کو بھی ایک رتبۂ بلند حاصل ہے۔ کیوں کہ یہ اسرارِ خودی کے مقدمے میں زیر بحث لایا گیا ہے۔اسناد کے طور پر شعری حوالوں کے اندراج کے تقریباً تیرہ سال بعد اسرار کا مقدمہ لکھا گیا جس میں دو فارسی کے اور امیری مینائی کا ایک شعر درج ہے۔

''مرزا بیدل علیہ الرحمہ لذتِ سکون کے اس قدر دل دادہ ہیں کہ ان کو جنبشِ نگاہ تک گوارہ نہیں۔

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رَنگِ تماشا را

اور امیر مینائی مرحوم یہ تعلیم دیتے ہیں کہ

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر ذہن تصویر کا'' [11]

وہ ارتقائے فکر کے ساتھ رواں دواں رہے۔نشیب و فراز بھی آتے رہے۔ احتساب کا عمل بھی جاری رہا جو اقبال کے ارتقائے فکر کی حکیمانہ علامت بھی ہے وہ اپنے اور دوسروں کے خیال پر غور و فکر کے ساتھ تنقیدی نظر بھی ڈالتے رہے۔اس رہ گزر میں آزمائش سے بھی گزرنا پڑا مگر فکر کی صحت اور سالمیت کے خلاف مفاہمت سے گریز کیا۔

امیر مینائی سے جذبۂ احترام رکھنے کے باوجود ان کے منفی رویے سے اختلاف کا اظہار کیا۔ اقبال کے فکری حسنِ سلوک کا یہ امتیاز بھی ہے۔ خواہ وہ دنیائے دانش ہو یا دین۔ اقبال نے صاحب نظر کی ایک شناخت بتائی ہے۔

ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

حواشی

۱۔ اسرارِ خودی اقبال خودی از عشق و محبت.....

۲۔ جاوید نامہ اقبال نوائے حلاج

۳۔ کلیات باقیاتِ شعرِ اقبال صابر کلوروی ۲۴۲

۴۔ اقبال اور آرزوئے انقلاب عبدالحق ۲۶

۵۔ کلیاتِ باقیاتِ شعر اقبال صابر کلوروی ۲۲۲

۶۔ فتنہ گور کھپور حکیم برہم ۱۶/ اگست ۱۹۱۱ء

۷۔ مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج سنہ ۱۳ ۱۲

۸۔ ..... // ..... // ۱۴

۹۔ ..... // ..... // ۱۶

۱۰۔ ..... // ..... // ۱۸

۱۱۔ اسرارِ خودی اقبال مقدمہ

اقبال تہذیبی کثرتوں کے شاعر

اقبال اس لیے بھی عظیم ہیں کہ وہ بنی نوع انسان کے آفاقی اقدار کے حدخواں ہیں جس کثرت اور کشادگی کے ساتھ جاں فروز قدروں کا ذکر ان کے فن میں موجود ہے وہ دنیائے ادب میں باید وشاید کہیں نظر آئے ان کی فکر کا نقطۂ نمود آدمِ خاکی ہے۔اس کی مدح سرائی فکرِ اقبال کا مقصود ومنتہا ہے۔ انسان اور اس کے متعلقات کی نوع بہ نوع جمال آفریں صورتیں فکرِ اقبال کو فروغ بخشتی ہیں۔ کرۂ ارض کے حسین مظاہر کی ایک جلوہ گاہ ہندوستان ہے۔ جو تنوع اور تکثیریت کی حیرت خیز مثال ہے۔ ملک کے مختلف مظاہر کی دل کشا صورتیں فکر اقبال کو مہمیز کرتی ہیں وہ تکثیریت اور تخالف کے ہجوم میں وحدتِ آدم کا فکر آفریں تصور تخلیق کرتے ہیں وہ تہذیبِ حجازی کا دل دوز تذکرہ کرتے ہیں۔ یونان ومصر روما کے عروج وزوال کا بیان ترانۂ ہندی میں اشارتاً موجود ہے۔تہذیب ہند کے آثار کو خوش آیند کہتے ہیں۔تہذیب فرنگ پر طعن کرتے ہیں۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
مگر مغربی تمدن کے اچھی قدروں کی تعریف بھی کرتے ہیں۔
کھلے ہیں سب کے لیے غریبوں کے مے خانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
پھر جدید تہذیب سے گریز کرتے ہیں یا
تہذیبِ نوی کا رکبہِ شیشہ گراں ہے

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے ۲

ان مشاہدات گلشن راز میں تہذیب حاضر کوالاؤ کہا ہے جو باہر اور اندر سے راکھ کا ڈھیر ہے یا منزلوں سے گزرنے کے بعد اقبال تکوینی تصور کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو تخلیق کائنات کا موجب ومقصود ہے۔ یہی نکتہ فکرِ اقبال کی معراج ہے۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

(جاوید نامہ)

یہ بڑی حقیقت ہے کہ اقبال نے تہذیبی بست وکشاد کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی فکری بصیرت نے اس کے عروج وزوال کے پیچ وخم سے آگہی بخشی تھی۔ ہندوستان عداوتوں کے ایک ہیجان دور سے گزر رہا تھا۔ اقبال ان سے بے نیاز نہ تھے۔ وہ مقدور بھر محبت کے پیغام کو عام کرنے کے لیے سرفروش تھے۔ ملک تہذیب کے بکھرے دانوں کو ایک رشتۂ تار میں پرونا ان کی فکر ونظر کا حاصل ہے۔ ان کی نظر میں اسلامی ثقافت بنی نوع انسان کی تاریخ وتہذیب کا نقطۂ معراج ہے۔ جوابرِ نیساں بن کر برسا اور روئے زمین کو شاداب کر گیا۔ یہی اقبال کے فکر وشعر کا محرک ومآخذ بھی ہے۔ اسلام کی تفکیری وتخلیقی تاریخ میں اس تہذیب کا اقبال سے بڑا کوئی ترجمان ہے اور نہ ترانہ ساز۔

نغمۂ ہندی ہے تو کیا ہے حجازی ہے مری

(شکوہ)

ان کی وابستگی جذب وجنون سے سرشار ہے وہ قافلۂ حجاز کے حدی خواہ ہیں مردِ میداں اور میرِ لشکر بھی۔ اس حقیقت سے گریز کر کے اقبال کی تفہیم گمرہی ہے اس گمرہی کے سبب کئی ناقدین کو پایانِ کار بہت پشیمان ہونا پڑا ہے۔ دنیا میں فنونِ لطیفہ کے لازوال فن پارے سے اسی حقیقت کے مظہر ہیں کہ سرچشمۂ تخلیق کا سب سے مؤثر مصدر تہذیب ہے۔

بدھ مذہب کو عالمی منظر نامے میں محترم مقام حاصل ہے۔اقبال نے بانیٔ مذہب کے ساتھ اس تہذیب کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔کلام میں جابجا ذکر موجود ہے۔ جاوید نامہ میں گوتم بدھ کے حوالے سے فکر انگیز تصورات پیش کیے گئے ہیں ۔ جو اس تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں فلک قمر پر طاسین گوتم کے ہستی ونیستی کے تصورات فکر انگیز ہیں ۔

مئے دیرینہ ومعشوقِ جواں چیزے نیست
پیشِ صاحب نظراں حورِ چناں چیزے نیست
آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تاجزائے عملِ تست چناں چیزے نیست

گوتم بدھ ایک اور مذہب کے بانی ہیں جو ہندوستان کی سرزمین میں پیدا ہوئے اور عالم میں ان کے پیرو پیغام کے حامل قرار پائے ۔ بدھ سے ہی بت و بت خانہ کا تصور پیدا ہوا۔لیکن ان کے ذکر سے بھی شعرا قبال خالی نہیں ہے۔

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بسایا خطۂ جاپان ملک وچیں میں نے

گوتم کے ذکر کے بعد زرتشت کا ذکر ہے۔انقلابی فکر کو اقبال زرتشت کی زبان سے ادا کرتے ہیں

از نگاہے کیمیا کن خاک را　　از مناجاتے بسوز افلاک را
خیز و در کاشانۂ وحدت نشیں　　ترک جلوت گوئے و در حلوت نشیں

طاسینِ مسیح پر حکم طالسطائی کی زبان سے تہذیبِ مغرب پر طنز دیکھیے

حکمتے کو عقدۂ اشیا کشاد　　تا تو غیر از فکرِ چنگیزی نہاد
اے بجانت لذتِ ایماں حرام　　اے پرستارِ بتان سیم خام

فرنگی تہذیب نے عقل ودانش کے چراغ روشن کیے اور اشیا کی حقیقت دریافت کی۔مگر اس رویے نے چنگیزی افکار کو فروغ دے کر غارت گری کا سامان بھی پیدا کیا۔ یہ ایمان کی لذت سے محروم اور مال ودولت کی پجاری بن گئے ۔

چین کے حوالے سے اس ثقافت کے اشاروں کی بازیابی کی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ اشعار تہذیب کے تفصیلی تذکرے کے متحمل نہیں ہوسکتے ایسی صورت میں اقبال کے اشارات سے تصور قائم کیا جاسکتا ہے۔ ان حوالوں کو دیکھیے جو مختلف کیفیت کے حامل ہیں۔

خودی بلند نہ تھی خوں گرفتہ چینی کی [۳]
فاش یوں کرتا ہے اک چینی حکیم اسرارِ فن [۴]
گراہ خواب چینی سنبھلنے لگے

اقبال نے حدیث رسولؐ میں موجود تلمیح بھی استعمال کی ہے۔

اے کہ حرفِ اطلبوا لوکان باسین گفتہ ای [۶]

عقیدتوں کی یہ کثرت اس ملک اور اس سرزمین کی اپنی شناخت ہے جس میں رنگ برنگ صورتیں باہم شیروشکر ہوکر سرودِ ربانی کو جنم دیتی ہیں۔ حرف دوئی کا یہ اتحاد بڑی دل کشی رکھتا ہے اور جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ اسی سلیقے میں ایک مالک ایک انسان اور ایک زمین کا احساس کروٹیں لیتا ہے۔ اور پوری انسانیت کے لیے محبت کا پیغام بن جاتا ہے۔

میں بندہ بنوں گا اس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا [۷]

اب ذرا مظاہرِ فطرت کے مختلف منظر کو ملاحظہ فرمائیں: پھولوں کی جو فراوانی یہاں ہے وہ کہیں نہیں۔ زعفران لالہ وگل، نرگس، سوسن، نسترن سے لے کر مشک وعنبر، عود غرض سبھی خوشبوئیں شعرا قبال میں مجموعۂ دلفروز بن جاتی ہیں۔

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونی کفن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

اقبال نے آتش چنار کا ذکر کیا ہے

جس خاک کے خمیر میں ہوا آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند ۸؎

ان کے ساتھ پرندوں اور چرندوں کی کہانیاں اور پروازِ شعری زبان میں ڈھل گئی ہے۔اقبال گھوڑا، گدھا، خچر، ہرن گائے اور بکری سے شیر تک، کوّا، کبوتر، فاختہ، گوریا سے شاہین تک شاعری کا موضوع قرار دیتے ہیں۔بلبل ہزار دستاں تو ادبی روایت کا سب سے پسندیدہ علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم بلبلیں ہے اس کی وہ گلستاں ہمارا

ہمارے روزانہ کے نغموں اور ترانوں میں شامل ہے۔دریاؤں کا بھی یہی حال ہے راوی جناب گنگ وجمن، رودِ کاویری سے گزر کا دریائے نیل دجلۂ دنیوب ونیل کی عظمتوں وصورتوں میں ڈھالتا ہے۔اقبال نے ایک انتہائی خیال افروز بات کہی ہے ۔تمام جوتفصیلات کا حامل اور اس پوری گفتگو کا مرکزی نقطہ ہے۔کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا رازمخفی۔اقبال کو ملک کے کچھ بدخواہوں کی تنگ نظری اور کج فہمی سے بڑا قلق بھی تھا جو تہذیب وثقافت کی مضبوط دیواروں کو مسمار کرنے پر آمادہ تھے۔انہوں نے مہلک خیال یا نظریہ رکھنے والوں کی طرف اشارے بھی ہیں۔

ہندیاں بے گانہ از ناموس ہند

اقبال نے بڑے کرب اور اپنے مزاج کے خلاف ان پر ملامت بھی کی ہے یہ فکر کے اظہار کا یہ لہجہ اسی ذہنی کرب کا اشارہ ہے۔

تنگِ آدم ننگِ دیں، ننگِ وطن

ان تمام مختلف صورتوں یا پیکروں میں ایک وحدت کی روح کارفرما ہے۔جو ہماری تہذیب وتاریخ کو فروغ بخشتی ہے۔اس کا اظہار ہر دور میں دکھائی دیتا ہے۔اور یہ ہر دور کی سب سے بڑی ضرورت بھی رہے۔جو تقاضا بن کر ہمیں غور وفکر کے لیے آمادہ کرتی رہی ہے۔جہاں رنگ برنگ منظر ہمیں لبھاتے ہیں اور قلب ونظر کو گرماتے اور سنوارتے ہیں تو پھر رشتۂ اتحاد کے ہر تار کو طاقت وتوانا رکھنے کے لیے ہمیں سرگرم عمل رہنے کی

ضرورت ہے کیوں کہ یہی وہ نسخۂ شفا ہے جو ملک وقوم کے تمام اختلاف کو مضبوط ومتحد رشتوں میں پیوست رکھتا ہے اور چمن زار کو موسمِ خزاں سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی پیوستگی موسمِ بہار سے لطف اندوز ہونے کی ضمانت دیتی ہے۔

پیوستہ رہ شجرے امیدِ بہار رکھ

دوسری بات بھی بہت سی فکر انگیز ہے

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی انجمن میں [۹]

اقبال انسانی اخوت واتحاد کے مطالبے کو صرف ہندوستان تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے آفاقی رشتوں میں جوڑنے کی تدبیر سوچتے ہیں وہ ہر خطۂ زمین اور باشندوں کو عالمی اختلاط سے استوار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جمعیتِ اقوام کو سب سے مہلک اور پُرفریب تصور بناتے ہیں۔ وہ جمعیتِ آدم پر زور دیتے ہیں۔ انسان کی آفاقی اجتماعیت پر ان کی نظر ہے۔

اللہ، کائنات اور انسان کی یکتائی پر ان کے فکر وفلسفے کی بنیاد ہے جس میں کسی مفاہمت کی گنجائش نہیں۔ خالقِ کونین کے ساتھ ارض وسما سب ایک ہیں۔ زیرِ آسماں انسان کی وحدت بھی اسی طرح ناگزیر حقیقت ہے۔ پھر اختلاف ہنگاموں کا محل نہیں ہوسکتا۔

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو

مکر وفسوں کے پُرفریب نظریات سے تہذیبِ انسانی کی نگہبانی پر اقبال حد درجہ متوجہ ہیں۔ دنیا میں محاسب ہے تہذیب فسوں گر کا ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی ان کا نظریہ بنی نوع آدم کی آفاقی حیثیت کا ایک حکیمانہ اعلانیہ ہے۔

من اول آدم بے رنگ و بویم
ازاں پس ہندی و تورانیم

میں رنگ ونسل کے امتیاز کے بغیر اول وآخر ایک انسان ہوں بعد ازاں ہندی

وتورانی۔

جاوید نامہ میں عالمینِ محمدؐ کے ارشادات کی روح یہی آواز ہے۔

مذہب او قاطع ملک و نسب　　از قریش و منکر از فصلِ عرب
درنگا ہے او یکے بالا و پست　　باغلام خویش بر یک خواں نشست

انسانی اخوت کا یہ آفاقی اعلانیہ ہے جو انسانی اتحاد پر استوار ہے۔تہذیب مختلف عناصر کا ایک مرکب یا مجموعہ ہے۔جس میں جغرافیائی آب وہوا، زمینی رود اور اسلوبِ زندگی کے ساتھ طرزِ فکر کا اہم کردار ہے۔تہذیب کی سب سے محکم اساس مذہبی عقائد پر منحصر ہے۔اس اساسی پہلو پر اقبال کی نگاہ ہے۔رام اور کرشن ہندی عقائد کے دو بڑے رہنما ہیں۔رام پر اقبال کی ایک یادگاری نظم ہے۔کرشن کا تذکرہ اقبال نے اپنے پہلے شعری مجموعہ کے دیباچے میں کیا ہے۔اس عقیدے کے دوسرے متعلقات پر بھی اقبال نے بہت سنجیدگی سے اظہار خیال کیا ہے۔خدا دوست دوسرے پیکروں کا تذکرہ بھی بہت معنی خیز ہے۔جیسے وشوامتر، شنکر آچاریہ، سوامی رام تیرتھ وغیرہ نظم 'نیا شوالہ' اس سلسلے کی ایک فکر انگیز علامت ہے جو مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا نقطۂ اتحاد ہے اور تہذیبی کشاکش سے راہِ نجات بھی۔اس ابتدائی تصور کی معراج پایانِ عمر کے یہ اشعار ہیں۔

حرفِ بدرا برلب آوردن خطاست
کافر ومومن ہم خلقِ خداست
آدمیت　　احترام　　آدمی
باخبر شواز مقام آدمی [10]

بال جبریل کی غزل کا یہ شعر:

محبت کی رسمیں ترک نہ تازی
شہیدِ محبت کافر نہ غازی

ثقافتی سرمایہ کی روح کو فروزاں رکھنے اور وسیع تر فضا فراہم کرنے میں دو عناصر خاص طور پر کارفرما ہوتے ہیں۔ایمان وعقیدہ اور اندازِ فکر ونظر کی فعالیت سے تہذیب

وثقافت اعلیٰ اور دیرپا اقدار سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ان کی غیر موجودگی میں تہذیبی زوال سے دوچار ہوکر فنا ہوگئیں۔ان کے آثار باقی رہ گئے۔عالمی تہذیبوں کا حاصلِ مطالعہ یہی بتاتا ہے۔اقبال اپنے دین ویقین پر راسخ ہیں اور فکر ونظر میں فولاد کی طرح مستحکم ہیں۔ انہوں نے بڑی دانائی کے ساتھ انسانی تہذیب کی علم برداری کا شناس نامہ پیش کیا ہے۔کافر ومومن کا خلقِ خدا کہہ کر انسانی وحدت کے تصور کو بڑی عظمت بخشی ہے۔انہوں نے فلسفہ وفکر کی آمیزش سے اس تصور کو آفاقی وسعتوں اور رفعتوں کا حامل بنادیا۔ جسے تہذیبی تصورات کا اتمام کہہ سکتے ہیں۔جاوید نامہ کے اختتام پر بیٹے کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

منکر حق نزدِ ملا کافر است
منکر خود نزدِ من کافر تر است [11]

یعنی ملا کے نزدیک منکرِ حق کافر ہے۔میرے نزدیک اپنے وجود کا منکر کافر سے بھی بدتر ہے۔ یہاں ان کے انسانی وحدت کا تصور اپنی انتہاؤں سے ہم کنار ہے۔اقبال نے وحدتِ افکار وکردار پر بڑے حکیمانہ خیالات پیش کیے ہیں۔یہی وحدت بنی نوع بشر کی آفاقی تہذیب کی روح ہے۔

فلسفہ وفکر کے آفاقی سرمایہ میں یہ آوازِ اقبال کے سوزِ دروں کی مرحونِ نظر ہے۔

سوزِ او را از نگاہِ من بگیر

(ترمیم واضافہ کے ساتھ بیسویں صدی کی نویں دہائی کا ایک ریڈیائی نشریہ، بہ شکریہ اردو سروس)

حوالے

۱۔	ضربِ کلیم	محرابِ گل افغان کے افکار
۲۔	بانگِ درا	ظریفانہ
۳۔	ضربِ کلیم	ذوقِ نظر
۴۔	// //	رقص وموسیقی
۵۔	بالِ جبریل	ساقی نامہ
۶۔	کلیاتِ باقیات	شعرِ اقبال
۷۔	بانگِ درا	۱۹۰۷ء
۸۔	ارمغانِ حجاز	ملا حنیفم لالو پی کشمیر کا بیاض
۹۔	بانگِ درا	بزمِ انجم
۱۰۔	جاوید نامہ	خطاب بہ جاوید
۱۱۔	// // //	

اقبال تنقید کے تین فرزانے

ناچیز کی نظر میں آزادی کے بعد بھارت میں انتقادی ادب کے تین روشن زاویہ ظہور میں آئے۔ تثلیث کے یہ تینوں زاویے مختلف ہیں۔ اور متصادم بھی۔ مگر ہماری تنقید مجموعی طور پر انھیں کے فیض وفرزانگی کے نسب نامے سے بیش وکم کے ساتھ نسبت رکھتی ہے۔ یہ بھی ایک دل چسپ سچائی ہے کہ ہماری تنقید تدریس کے طفیل پروان چڑھی۔ یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ تنقید کی بعض بے حد مفید کتابیں اردو تدریس سے ناوابستہ بزرگوں کی ہیں۔ یہ تصانیف تنقیدی سرمایہ میں گوہرِ شاہوار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی 'روحِ اقبال' جس کے اب تک گیارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی 'نقوش اقبال' کی اب تک تیرہ اشاعتیں شائع ہو چکی ہیں۔ عابد علی عابد کی اصولِ انتقادِ ادبیات اور شعرِ اقبال خلیفہ عبدالحکیم۔ پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر اسلوب احمد انصاری وغیرہ۔ آخرالذکر دونوں اساتذہ کے ساتھ پروفیسر محمد حسن کی تدریسی سرگرمیاں تنقید کی شہ نشینی میں معاون ہوئیں۔ اول الذکر دونوں اساتذہ انگریزی ادب کی تدریس پر مامور تھے۔ آخرالذکر اردو سے وابستہ تھے مگر انگریزی کا ادراک بھی کم نہ تھا۔ بلکہ وہ ان دونوں بزرگوں سے زیادہ انگریزی میں لکھتے رہے۔ یہ ان کا خاص امتیاز بھی ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تینوں ناقدین کا اقبال ہی مرکزِ محسوس ہے جسے نقطۂ پرکارِ نقد بھی کہہ سکتے ہیں۔ اقبال ادبی مطالعہ کے لیے ہی نہیں ہماری فکر وثقافت کی ناگزیر علامت بن

چکے ہیں۔ان سے التفات کے بغیر فوز وفلاح کا امکان معدوم ہے۔تیسرا حسنِ اتفاق بھی خوب ہے۔انگریزی ادب کے کارشناسوں نے اقبال پر اردو میں کتابیں رقم کیں۔جب کہ پروفیسر محمد حسن نے انگریزی میں طبع آزمائی کی۔اگرچہ اردو میں لکھے گئے مضامین بھی خاصے ہیں جن کی مدد سے محمد حسن صاحب کی اقبال شناسی پر کتاب مرتب کی جاچکی ہے۔ جیسے رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور کے مضامین کی ترتیب نے صورتِ حال پیدا کی ہے ۔ان تینوں ناقدین کی فکر ونظر کے اسالیب الگ اور انفرادی ہیں۔اشتراک وامتزاج کی ایک راہ اقبال کے گھر سے گزرتی ہے۔ناچیز کی برہنہ گفتاری پر آپ برہم نہ ہوں تو عرض کروں کہ ہماری تنقید وتخلیق کی گزرگاہ اقبال کے جہاں فروز کہکشاں سے ہی گزرتی ہے۔ یہاں تنقید زیرِ بحث ہے اسی پر اکتفا کرنا ہے۔اردو کے بڑے سے بڑے نقاد کو اقبال سے شرف وسعادت حاصل کرنے کے بعد ہی اعتبار حاصل ہوا ہے۔تنقید کے تکوینی نظام کا یہ کلیہ قرار پاچکا ہے۔کہ عظمت وامتیاز کے لیے اقبال سے سروکار ضروری ہے۔آپ جب چاہیں اور جسے چاہیں پرکھ لیں۔

پروفیسر محمد حسن نے تقریباً ساٹھ کتابیں رقم کیں۔جن میں 'دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر' کو سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت ملی۔یہ حقیقت ہے کہ اس مرتبے کی اردو میں بہت کم کتابیں لکھی گئیں۔'اردو میں رومانوی تحریک' کو بھی حوالے کی حیثیت ملی۔ اقبال پر ان کی مختصر تالیف A NEW APPROACH TO IQBAL ہے جسے سرکاری ادارہ پبلی کیشن ڈویژن نئی دہلی نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا تھا۔دوسرا نقش ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آیا۔سرکاری سرپرستی میں اقبال پر شائع ہونے والی پہلی تنقیدی کتاب تھی۔جس کے مبادیات ومباحث مختلف اور بے حد متنوع ہیں۔عجیب بات ہے کہ پروفیسر محمد حسن جیسے سخت گیر مارکسی نقاد نے بڑی اعتدال پسندی کا ثبوت دیا ہے۔کتاب کے اختتام میں وہ نکتہ بھی بیان کر گئے جو اقبال شناسوں کے یہاں کم نظر آتا ہے۔

" Every word used in his poetry transforms itself into a power station of atomic energy full of verve

and vitality"

یہ فکر افروز اقرار بہت اہمیت کا حامل ہے۔تنقیدی مسائل پر ان کی دوسری کتابیں بھی وقیع ہیں۔افسوس ہے کہ جوش پر انگریزی میں لکھی گئی کتاب ابھی تک شائع نہ ہوسکی۔اصل مسودہ انہوں نے پاکستان بھیجا اس کی نقل ہندوستان میں ایک پروفیسر کے سپرد کی۔مگر تاحال اشاعت کی اطلاع نہ مل سکی۔یہ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ مختصر کتابیں ضخیم تالیفات کے روبروز یادہ پسند کی گئیں۔جیسے رشید احمد صدیقی کی مختصر کتاب 'غالب شخصیت اور شاعری' غالب پر راقم کے نزدیک بہت ہی مفید اور جامع کتاب ہے۔گو مختصر ہے۔لیکن یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ رشید صاحب کے بعض جملے اتنے جامع اور خیال انگیز ہیں کہ ان کی شرح وبیان کے لیے کتاب درکار ہوتی ہے۔یہ ان کا وصفِ خاص ہے جدید انتقادی سرمایہ میں دو جملے محاوۂ تنقید بن کر بہت مشہور ہوئے۔پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کا غزل کو اردو شاعری کی آبرو بتانا اپنی فکر انگیزی اور جامعیت میں بے مثال ہے۔درحقیقت سرمایۂ غزل کا اس سے بہتر تعارف ممکن نہیں۔دوسرا جملہ پروفیسر کلیم الدین احمد کا ہے۔اردو میں تنقید کو معشوق کی موہوم کمر سے تعبیر کرنا ایک انتقادی محاورہ بن گیا۔یہ طلبا واساتذہ کے لیے حوالہ کے ساتھ قیل وقال کا موضوع بھی رہا ہے۔دونوں جملے ایک طرح سے قولِ فیصل بن کر مقبول ہوئے اور سکۂ زر بن کر رائج ہوئے۔دونوں جملے فکری اور معنوی تہہ داری کے حامل ہیں۔رشید احمد صدیقی نے برسوں کی فکری ریاضت کے بعد اپنے مخصوص لہجے میں اسے تراشا ہے۔ان کا قول ایک اعلانیہ ہے غزل کو یہ اعزاز واحترام کسی اور کے قلم سے نہ مل سکا۔حکیمانہ نکات کو تنقیدی جملوں میں تراشنا اور معنی کا جہان پیوست کرنا ان کا بڑا امتیاز ہے۔اس کی پیروی نہ ہوسکی اور تنقید کا یہ شجر برگ وبار نہ لاسکا۔اس لیے کہ موصوف کی تخلیقیت اور صناعی کی رہ گزر آسان بھی نہیں۔رشید صاحب کا ذکر اس لیے بھی آ گیا کہ ہمارے انتقادی ادب کو ایک نئی جہت ملی تھی جس میں ثقافتی روح کا سوزِ دروں اور تخلیق کے ممکنات کو اقدار کی روشنی سے فروزاں ہونے کا ہنر موجود تھا جو دوسرے نقادوں کے لیے آزمایشی تھا۔بے ذوق لوگ نہیں تھے مگر کم کوش ضرور تھے۔

پروفیسر آل احمد سرور سے امید تھی مگر نبھ نہ سکی۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کی دونوں کتابیں اپنی افادیت اور شہرت میں بے نظیر بن کر مقبول عام ہوئی۔ ''اردو تنقید پر ایک نظر'' اور ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کو ہر خاص و عام نے قبول کیا۔ موافق و مخالف کے لیے ناگزیر تصانیف کے طور پر تسلیم کی گئیں۔ موصوف انگریزی ادب و انتقاد سے آشنا تھے مگر مشرقی ادب و اقدار بھی ان کی رسائی میں تھے۔ ہماری تنقید و تخلیق نے ایک معیار دیا ہے کہ بڑی تخلیق و تنقید کے لیے ذولسان ہونا ضروری ہے اس طریقۂ علم کی بڑی مستحکم بنیاد بھی ہے۔ ایک دو استثنائی صورت ہو سکتی ہے۔ اس میزان کو خاطر میں رکھنا چاہئے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور پروفیسر محمد حسن ذولسان تھے اور تنقیدی کارگہی کے اداشناس بھی تھے۔ یہ جامعیت اس دور کے ناقدین کا سرمایۂ سخن نہ بن سکا۔ انگریزی میں دوسرے ناقدین کی کتابیں ندارد کے برابر ہیں۔ پروفیسر محمد حسن کو ان دونوں میں امتیاز حاصل ہے۔ اقبال پر انگریزی کتاب کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی دوسری اہم کتاب THOUGHT PATTERNS OF XIX CENTURY LITERATURE OF NORTH INDIA ہے۔ یہ ۱۹۹۰ میں کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ اردو کے ایک نقاد کا مختلف ادبیات کے فکری رجحانات پر قلم اٹھانا ایک حیرت خیز کارنامہ ہے۔ ان جیسی جامعیت ناچیز کی نظر میں نہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی وسعتِ نظر اور مطالعہ کا صحیح ادراک بھی قابل فخر ہے۔ ان تینوں کی جملہ مساعی نے اردو تنقید کی راہِ کہکشاں آباد کی ہے۔ ان راستوں کے نقش و نگار آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جب کہ دوسرے ناقدین کے پیروکار راہِ رفتگاں پر دو قدم بھی نہ چل سکے۔ دوسرے ناقدین کی کاوشیں بھی دھیرے دھیرے معدوم ہو چلیں۔ ان کے حوالے بھی مفقود ہو رہے ہیں۔ ایک دور تھا کہ پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر احتشام حسین کی تنقید کحل البصر (آنکھوں کا سرمہ) بنی ہوئی تھی۔ بعد ازاں موہوم تحریکوں کے زیر سایہ پلنے والے ناقدین کا گروہ پیدا ہوا۔ کچھ دیر ہنگامہ ہائے شوق کی آندھی چلی مگر بہت جلد ہزیمت کے احساس سے پشیمانی دامن گیر ہوئی۔ اس

شور وغوغا میں ادب کا نا قابلِ تلافی زیاں ہوا۔

شکر ہے کہ اس زیاں خانے میں تنقید کے فرزندانِ تثلیث کی کاوشیں ہماری رہ نمائی میں گامزن رہیں۔ جدید وقدیم غرقِ دریا ہوئے ۔تشکیل وقرأت کے دلائل بھی بُرد باد ہوگئے ۔مگر ان تینوں بزرگوں کے کارنامے آب وتاب کے ساتھ کتابِ حوالہ بنے ہوئے ہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی کتاب 'اقبال کی تیرہ نظمیں' توسیع واضافے کے ساتھ متواتر شائع ہورہی ہے۔ دوسرے دونوں بزرگوں کی تصانیف کا بھی یہی حال ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کی مذکورہ کتابوں کے علاوہ ان کی اہم کتاب 'اقبال ایک مطالعہ' ہے۔ جو تنقید کی کمیں گاہوں کے ساتھ تحسین شناسی کی بھی مثال ہے۔ان کی سخت گیری کے ساتھ یہ اقرار بھی دیکھیے۔

> ''(غزلوں میں) روانی زیادہ ،گھلاوٹ زیادہ شیرینی زیادہ ہے ۔کبھی کبھار تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک جوئے نغمہ رواں ہے جو ہمیں ہلکی لیکن آگے بڑھتی ہوئی موجوں میں بہائے جاتا ہے اور ہم بے اختیار بہے چلے جاتے ہیں۔''

(اقبال ایک مطالعہ ۲۸۳)

ان بزرگوں کے بعد کی نسل میں بعض معاصرین کو اللہ نے صلاحیتوں سے نوازا تھا مگر وہ جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری میں مصروف ہوگئے نئے نظریہ اور نہاد کی خیرگی راس نہ آئی ۔آستانِ غیر پر قیام سے کسی کا بھلا نہیں ہوا۔اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا حوصلہ بھی جاتا رہا۔تنقید کو درماندۂ راہ ہونا پڑا۔ جدیدیت کی فلسفیانہ تعبیر ابہام اور غول بیانی کا شکار ہوگئی۔ عالمی ادب کی تاریخ مرتب کرنے والے بھی نگوں سار ہوئے ۔مشرقی اصولِ نقد کی سایہ نشینی بھی ساتھ نہ دے سکی۔ان دوستوں میں ان کی بساط بھر ایک قوت تھی۔ جسے روبہ عمل نہ لایا جاسکا۔ کیوں کہ اپنے ادب وثقافت سے فراموشی اور مغربی تحریک وتلاطم سے ہم

آغوشی کے سبب کئی معتبر نقادوں کو زیاں کار بننا پڑا۔ نقد و انتقاد کے ساتھ تخلیق کا بھی نقصان ہوا۔ تنقید کا شور برپا تھا۔ پروفیسر حامدی کاشمیری نے اکتشافی تنقید کا راستہ اختیار کیا جو مسدود تھا۔ کئی ناقدین نے میر و غالب و اقبال سے مراجعت کی۔ 'خورشید کا سامانِ سفر' لکھا گیا۔ مگر مذکورہ فرزندانِ تثلیث کے اقبالیاتی ادب والی بات نہ بن سکی۔ ان کی دوسری تنقیدی کتابیں وقیع ہیں اور قابلِ قدر بھی۔ شمس الرحمان فاروقی تنقیدی ادب کے عاشقانِ پاک طینت ہیں۔ چند تصانیف کی اہمیت رہے گی۔ گو مذکورہ بزرگوں کی ہم سری سے قاصر رہے۔ ان کے ساتھ شریکِ سفر ہونا آسان بھی نہ تھا۔ ان بزرگوں کی بصیرت، جفاکشی اور فکر رسا کی ہم نوائی میں جان و دل کی آزمائش تھی۔ سود و زیاں کا شمار کرنے والے شامل نہ ہو سکے۔ مگر ان کی روایات کی پاس داری میں پوری نسل سرفروش ہے۔ توقع ہے کہ ہماری تنقید کے قبیلۂ کشتگان سے مردِ ازغیب کا نمود ہوگا۔ جو نقد و انتقاد کی کشتِ ویراں پر ابرِ نیساں بن کر برسے گا۔

اقبال اور متعلقاتِ اقبال

پروفیسر عبدالحق

ریختہ ڈاٹ کوم کے روبرو سریز میں

یوٹیوب پر جاری نشریہ

ڈاکٹر معید رشیدی (روبرو۔ میں سوال کرنے والے)

گفتگو کو قلم بند کرنے والے

محمد سلمان جون پوری

اقبال اور متعلقاتِ اقبال

سوال:۔ آپ دیکھ رہے ہیں ریختہ فاؤنڈیشن کی خاص پیش کش ۔ریختہ روبروسریز میں موجود ہیں مشہور ماہرِ اقبالیات، محقق نقاد اور استاد ڈاکٹر عبدالحق آیئے ان سے ملتے ہیں باتیں کرتے ہیں۔عبدالحق صاحب یہ ریختہ فاؤنڈیشن کی بے حد خاص پیش کش ہے۔جس میں ادبی شخصیات کو ہم زحمت دیتے ہیں اور ان کی زندگی کے احوال سے خود بھی واقف ہوتے ہیں اور جو ادب کے چاہنے والے ہیں انھیں بھی واقف کراتے ہیں آج ہم آپ کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر بھی گفتگو کریں گے آپ کی علمی خدمات پر بھی ۔آپ کے تعارف میں یہ بتانا بھول گیا کہ آپ دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر رہے اور آج پروفیسر ایمرٹس ہیں آپ نے تذکروں پر کام کیا، تاریخ پر کام کیا، لغت پر کام کیا، تحقیق ،تنقید، خاکے اتنے شعبے ہیں جن پہ آپ نے اپنی خدمات انجام دی ہیں ۔غالباً ۱۹۳۹ء میں آپ کی پیدائش جونپور میں ہوئی ہے اس وقت آپ کے بچپن کا جونپور کیا تھا، گھر کا ماحول کیا تھا۔مختصراً والدین کے بارے میں خاندان کے بارے میں آپ ہمیں کچھ بتاسکیں تو عنایت ہوگی۔

جواب:۔ عزیزم سب سے پہلے تو میں اس فاؤنڈیشن کا شکرگزار ہوں کہ دور سے اس ادارے کی جلوہ گری کا ذکر تو سنتا تھا لیکن آج بقول علامہ اقبال ''ان آنکھوں نے دیکھا تو عالم ہوا روشن'' جیسی کیفیت ہے میں آپ کا بھی شکرگزار ہوں کہ آپ سے جب بھی ٹکراؤ ہوتا ہے تو انٹرویو ہی کے بہانے یہ نوبت آتی ہے کہ آپ سوال کرتے ہیں اور میں اپنے

ایک عزیز کے سامنے روبرو جواب دہ ہوتا ہوں۔ معاملہ یوں ہے کہ ایک دیہات میں جنم لینے کا جو فیضان ہوتا ہے اس سے فیضیاب ہوا لیکن وہاں کی جو کوتاہیاں ہوتی ہیں وہ لغزش پا بھی زندگی کے ساتھ کم سے کم ابتدائی دور میں میرے ساتھ وابستہ رہیں۔ والدین پڑھے لکھے نہیں تھے بس روزہ نماز کی حد تک کچھ سورتیں انہیں یاد تھیں نماز وہ بڑی نیازمندی کے ساتھ ادا کرتے تھے، حد یہ ہے کہ میرے والد صاحب دس سال تک گاؤں پر دھان رہے ان کو دستخط کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ گاؤں کے مولوی مظفر حسین صاحب نے ہندی میں کسی صورت دستخط کرنا سکھایا کبھی کبھی حیرت بھی ہوتی ہے کہ یہ قسمت کے عجائبات ہیں جس کے والدین ناخواندہ ہی نہیں حرف شناسی سے بھی کوسوں دور رہے ہوں ان کا بیٹا آج کے علمی معیار میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوا اس کے بارے میں نہ سوچ سکتا تھا لیکن یہ قسمت کی بخت آوری کہیے کہ مجھے پڑھنے ہی سے مشغلہ تھا والدہ کی تاکید بھی تھی شروع میں قرآن شریف پڑھنے کا موقع ملا۔ ہمارے گاؤں میں ایک خاتون بیاہ کے آئیں قرآن شریف کا درس دینے لگیں ان کے یہاں میں نے قرآن شریف پڑھنا سیکھا اور گاؤں میں ایک مدرسہ ہوا کرتا تھا وہاں پر گاؤں کے ہی ایک استاد تھے مظفر حسین صاحب وہ زبردستی بچوں کا نام لکھ لیا کرتے تھے تاکہ ان کا کاروبار چلتا رہے کچھ بچے داخل ہوں اور اردو کے نام پر کچھ پڑھنے والے ہوں وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلم گھرانے میں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے اور دو تین سال کا ہے کم ہے یا زیادہ ہے وہ نام لکھ لیا کرتے تھے اس طرح سے نام لکھا گیا۔ اس وقت اس کا نام اسلامیہ اسکول ہوا کرتا تھا بعد میں اس کا نام اردو میڈیم اسکول رکھا گیا وہاں پر درجہ دو تک پڑھائی ہوئی۔ گاؤں کی فضا بڑی خوش گوار ہوتی تھی موسموں کے اعتبار سے ہم بہت پر کیف ہوتے تھے۔ مثلاً آج اس گرمی کا شکوہ ہے گرمی ہم لوگوں کی گھر میں نہیں گزرتی تھی بلکہ آم کے باغوں میں گزرتی تھی۔ اس طرح گزرتی تھی کہ گرمی کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔ گاؤں کے سارے بچے وجہ بے وجہ والدین سے یا تو مفرور ہو کر یا دوپہر کی دھوپ سے بچنے کے لیے بڑے مزے سے کھیلتے کھاتے تھے اور طرح طرح کے کھیل بھی ہوتے تھے لیکن یہ میری بدتوفیقی تھی کہ مجھے کھیل سے کوئی نسبت نہیں تھی کبھی

کبھار کبڈی کھیل لیا کرتا تھا یا ذرا بڑا ہوا تو والی بال اس کے علاوہ مجھے کسی اور کھیل میں دلچسپی نہیں تھی والدہ کی تاکید بھی تھی اور ظاہر ہے کہ والدہ کے زیرِ سایہ میری پرورش ہوئی والد صاحب تو ممبئی میں تھے ٹیکس ٹائل مل میں۔مزدوروں کی فراہمی کا گویا ان کے پاس کاروبار تھا مختلف علاقوں سے انتخاب کرتے۔یہ وہ علاقہ ہے جو کپڑا سازی میں پورے ہندوستان میں مشہور ہے تھوڑے فاصلے پر بھدوہی شہر ہے بنارس بھی قریب ہی ہے۔ظاہر ہے قالین سازی کے معاملے میں بھدوہی اور بنارس کی زردوزی کا کام پوری دنیا میں مشہور ہے یہ ہنر دور دراز تک کے گاؤں میں کچھ لوگ جانتے تھے اور گھر میں بھی اس طرح سے کرگھا لگا کر کام کرتے تھے، وہ ہنر ممبئی کی ملوں میں بھی بڑا کام آتا تھا۔کاریگر جو اس کام میں تجربہ رکھتے تھے، والد صاحب ان کا انتخاب کرتے ان کی پوری زندگی اسی کام میں گزری شکر ہے کہ پورے گاؤں کی زمین بڑی زرخیز تھی اور اس کی زرخیزی کا یہ عالم تھا کہ دوسرے گاؤں یا شہر کی ضرورت کم پڑتی خود کفیل تھے۔سبزی سے لے کر ہر کاشت اور باغوں کے تقریباً بیشتر موسمی پھل ملتے۔اس لیے زندگی بھی بڑی خوش گوار تھی اور ایک کفالت بھی تھی گاؤں کے اسکول کے بعد مچھلی شہر اسلامیہ اسکول میں داخلہ لیا وہ اب بھی اسی جگہ پر قائم ہے۔وہاں پر شہر کے لوگوں سے ملاقات ہوئی ظاہر ہے میں گاؤں کا باشندہ تھا اور گاؤں کے آداب مختلف تھے، مچھلی شہر کے باشندوں سے اور وہاں کے طلبہ سے ملاقات ہوئی۔کبھی کبھی ایک کمتری کا احساس ہوتا تھا کیوں کہ ان کی زبان بھی صاف وشستہ تھی اس زمانے میں جو اساتذہ وہاں تھے انہوں نے ہمارے اوپر خاص توجہ دی کیوں کہ ان اساتذہ کی رشتہ داریاں بھی گاؤں میں تھیں اور ان کا آنا جانا بھی تھا۔والد صاحب سے وہاں کے مدرسین کا خاص تعلق بھی تھا۔مولوی عزیز صاحب، مولوی اظہار صاحب ،مولوی خورشید صاحب یہ سارے حضرات وہ تھے جو بڑی عنایت اور کرم فرمائی کا خیال رکھتے۔پرائمری اسکول سے فارغ ہوئے تو مچھلی شہر کے مڈل اسکول میں داخل ہوا یہ مچھلی شہر تحصیل کا اعلیٰ پیمانے کا مڈل اسکول تھا۔بہت اچھی عمارت بہت اچھا کیمپس لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ درجہ آٹھ میں ہی وہ مڈل اسکول ہائی اسکول میں ضم ہوگیا ،اسی اسکول سے ہائی

اسکول بھی کیا۔وہاں کے اساتذہ بڑے دلنواز اور بڑے کرم فرما تھے خاص طور پر حافظ مہدی صاحب ،اختر صاحب اور دوسرے اساتذہ جو انگریزی کے ہندی کے مختلف مضامین کے تھے۔ان سے ایک جلا ملی علم کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا کچھ ان کی زبان ان کا لہجہ ان کا رکھ رکھاؤ ان کا انداز بیان میں بہت متاثر ہوا۔خاص طور سے ماسٹر اختر صاحب جو آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے شاعری بھی کرتے تھے حالانکہ وہ مزاحیہ شاعری کے لیے مشہور تھے حافظ مہدی صاحب بڑے عالم تھے شہر کے خطیب بھی تھے لیکن یہاں ایک بزرگ شخصیت ہوا کرتی تھی مولانا محمد عمر جعفری کی جو شہر کے سب سے بڑے رئیس تھے سیاست میں انہیں بڑا دخل تھا یعنی مچھلی شہر کے سیاسی معاملات میں بڑے دخیل تھے ان کی ایک لائبریری تھی جو بڑی بیش بہا لائبریری تھی اس میں مخطوطات کا حصہ بڑا نایاب ذخیرہ تھا اس کا ذکر مولانا امتیاز علی خاں عرشی رام پوری نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔انہوں نے دیکھا بھی ہے اس وقت ظاہر ہے مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کبھی اتفاق نہیں ہوا لائبریری جانے کا جب دہلی یونیورسٹی آیا ریسرچ سے کچھ شغف ہوا پھر اس کے بعد میں نے اس لائبریری سے استفادہ کیا اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔۱۹۵۵ء میں ہائی اسکول کیا میرے والدین پڑھانا نہیں چاہتے تھے گھر کی ذمہ داری پر توجہ تھی جو کاشت کاری اور زمینوں کی دیکھ بھال کرے اور ان کی نظر کے سامنے رہے کیونکہ اکیلی اولاد تھی، ظاہر ہے ان کی خواہش یہی تھی سامنے رہیں لیکن ہمارے تایا جو اس زمانے میں گورکھپور میں تھے کورٹ آف وارڈس کے مینیجر تھے خاصے بالغ نظر تھے ان کی نظر میں شاید میں کچھ اچھا لگا۔انہوں نے مجھے گورکھپور بلا لیا کہ تم یہاں پڑھو گے گورکھپور اسلامیہ کالج میں داخلہ ہوا۔

سوال:۔ اچھا میں آپ کو یہاں پر ذرا روک رہا ہوں تعلیم کا سفر ایک ترتیب میں اسی طرح آگے بڑھے گا کیوں کہ ابھی جون پور میں موجود ہیں اس سے پہلے کہ ہم گورکھپور چلیں ۔میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ یہ بتائیں جونپور جو شہر ہے اتر پردیش کا یہ جو خطہ ہے یہ تاریخی اعتبار سے علمی اعتبار سے کتنا اور کس قدر مالا مال ہے؟

جواب:۔ ڈاکٹر صاحب یہ تو بعد میں مجھے احساس ہوا جب ذرا تحقیق سے تعلق بڑھا تب

اندازہ ہوا کہ جونپور ماضی میں مرکزِ علم وادب تھا اس کی علمی فتوحات ہیں میں یہ آپ سے بلا تکلف عرض کرتا ہوں کہ ہندوستان کا کوئی خطۂ زمین جونپور کی علمی یافت کا حریف نہیں ہوسکتا جونپور کی جو تاریخی یافت ہے۔آپ اندازہ لگائیں کہ اردو اور ہندی کی پہلی کتاب اسی نواح کی یادگار ہے ملا داؤد کی چندائن اسی دیار کی دین ہے ملا داؤد وہ شخص ہیں اور چندائن وہ کتاب ہے جس نے خسرو کی پوری تاریخ کو غلط ثابت کر دیا خسرو کی جس زبان جس کلام جس ریختے پر بعض لوگوں نے گمراہیاں پھیلائی ہیں ملا داؤد کی اس کتاب سے سب غلط ہوگئیں۔اس لیے کہ خسرو کی یہ زبان نہیں ہے جو ملا داؤد کی ہے دونوں ہم عصر ومعاصر ہیں دونوں تیرہویں صدی کی یادگار ہیں لیکن دونوں کی زبان میں فرق ہے کئی ماہرین نے خسرؔو کے کلام کو غلط ثابت کیا ہے اردو کی تاریخوں میں ذکر ملتا ہے کہ مولانا عبدالرشید گنگوہی قطبن منجھن اور آپ چھوڑ دیجئے میں تو اس پر فخر کرتا ہوں یہی وہ دیار ہے جہاں پدماوت لکھی گئی جس کا کوئی حریف نہیں یہی دیار ہے جہاں رامائن کی تخلیق ہوئی اور یہی وہ دیار ہے جو گوتم بدھ کی سرزمین ہے یہی وہ دیار ہے بنارس جونپور میں ۵۳ میل کا فاصلہ ہے جہاں کبیؔر نے جنم لیا اور پورا ایک پنتھ شروع ہوا اس سے تھوڑی دور اور چلیے تو گورکھپور وہ دیار ہے اور شاہان شرقی کا ہی علاقہ ہے جہاں گورکھناتھ پنتھ شروع ہوا ۔مہدوی سلسلۂ اسی شہر کی یادگار ہے جو افغانستان تک ہے۔مذہبی اعتبار سے اور علمی اعتبار سے اور میں ادبی اعتبار سے عرض کروں آپ تو ادب شناس ہیں کہ اردو کا کوئی اور خطہ اتنا شاداب نہیں جو جونپور کی ماضی کی یافت ہے اور آج بھی میں اس بات کا اعتراف کررہا ہوں۔شمس الرحمان فاروقی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ دیار مشرق جو ہے یہ آج بھی ہندوستان کی ادبی نمائندگی کا ایک نشان راہ ہے آپ یہ دیکھیے فراق یہیں ہیں،نرالاؔ یہیں ہے اور یہیں پر اسلامی الہیات کی جو سب سے معرکۃ الآرا کتاب لکھی گئی شمس بازغہ آج بھی قاہرہ اور اسلامی یونیورسٹی کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہے یہ جونپور کی یادگار ہے یہیں پر ہمارے شہر میں تفسیر رشیدی بھی لکھی گئی جو خانقاہِ رشیدیہ کے بانی ہیں۔مولانا محبّ اللہ الہ آبادی پہلے شخص ہیں جنہوں نے فصوص الحکم کی تشریح لکھی یعنی ابن عربی کی کتاب کی پہلی

شرح لکھی گئی۔اس کے بعد آپ دیکھیے آج بھی شبلی اور رشید احمد صدیقی کا کوئی حریف نہیں ۔فتاویٰ عالمگیری کے کئی مرتبین یہیں کے باشندے ہیں۔

سوال:۔ مغل دور میں بھی یہ خطہ مرکزی مقام رکھتا تھا۔

جواب:۔ یہ تو کتابوں میں لکھا ہوا ہے خاص طور سے ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے جو تحقیق کی ہے مشرقی سلاطین آف جونپور نوسو علماء کی پالکیاں ہر سال نکلتی تھیں۔علماء حضرات کے نام پر گاؤں اور محلے آباد تھے اور ان کی پالکیاں نکلتیں۔ابراہیم لودھی نے جب اس کو شکست دی مشرقی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور وہاں کے تمام علماء کو جبراً کہیے یا کسی صورت دہلی منتقل کیا گیا بلکہ کتابوں میں ہے کہ دہلی میں علم کا چراغ جونپوری علماء کی بدولت روشن ہوا۔آپ اندازہ لگائیں یہ تو سرزمین کی تاریخ ہے۔میں آپ سے بالکل سیاسی بات کر رہا ہوں جو شاید اچھی لگے کہ اسی سرزمین نے چھ وزیر اعظم دیے ہیں ملک کو اور ہندوستان کا کوئی ایسا علاقہ نہیں ہے یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اس کی ایک بڑی شاندار تاریخ رہی ہے اور آپ سے عرض کروں کہ محلے محلے نہ سہی لیکن ہر شہر میں ہر قصبے میں ایک لائبریری ہوتی تھی ،گاؤں میں بھی لوگوں کو لکھنے پڑھنے کا شوق نہ ہونے کے باوجود بھی لوگوں میں زبانی کتابیں سننے کا بڑا چلن تھا، چوپال بنا کر لوگ سنتے تھے چاہے وہ مرثیے کی محفل ہو یا غزل خوانی کی محفل ہو حد یہ ہے کہ میں نے انور جیسا ناول بھی اپنے ایک بزرگ سے ہی سنا حالانکہ ہم لوگوں کو بزرگوں کے درمیان بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی وہ بہ آواز بلند پڑھتے تھے ہم لوگ سنتے تھے اسی طرح سے میلاد شریف کی محفل میں شہادت نامہ، فاطمہ نامہ، معراج نامہ وغیرہ پڑھا جاتا۔آپ اندازہ لگائیں کہ خلیل صاحب پدماوت کو محفل میلاد میں بھی پڑھا کرتے تھے یہ فضا تھی حرف شناسی کی، عام فضا نہ ہونے کے باوجود بھی لوگ علم سے بیگانہ نہیں تھے اور میں آپ سے یہ عرض کروں لکھنا پڑھنا تو ایک ہنر ہے ذہانت اور تخلیق ایک الگ شے ہے جونپور کی جو فضا تھی اس اعتبار سے بڑی پختہ اور بڑی تخلیق آور تھی جس میں بہت سے لوگ موجود تھے آپ سمجھیے کہ مچھلی شہر ایک چھوٹا شہر ہے لیکن جونپور کے اساتذہ کی تعداد حضرتِ داغ کے شاگردوں کی بڑی تعداد مچھلی شہر میں تھی اور عرصے تک ان لوگوں کے شعر

وادب کی محفل آباد تھی ۔ضابطے سے طرحی مشاعرے ہوتے اور آپ کو میں بتاؤں شاید ہندوستان میں کہیں نہیں ہوا کہ عاشورہ اور بارہ وفات کی جو محفلیں ہوتی تھیں ان میں مختلف بزرگوں اور ان کے مرثیے پڑھے جاتے گروہ در گروہ کارواں کی صورت میں چلتے تھے اور ان کا ایک جلسہ ہوتا تھا جلوس کی صورت میں ایک استاد کی نعت پڑھی جارہی ہے اور اس میں سیکڑوں افراد شریک ہورہے ہیں اور وہ گزر رہا ہے اور پھر دوسرے استاد کا گروہ آرہا ہے ظاہر ہے اس فضا میں شعرخوانی عام تھی جب میں مچھلی شہر آیا تو دیکھا کہ بیت بازی کا شوق عام تھا بچوں میں بیت بازی ہوتی اس میں اساتذہ بڑی دل چسپی لیتے تھے اور اس دور میں شہیرؔ مچھلی شہری کا کلام شائع ہو چکا تھا متینؔ مچھلی شہری ہادی مچھلی شہری شعراء کے اشعار زبانوں پر تھے۔

سوال:۔ سلامؔ مچھلی شہری دہلی آچکے تھے یا

جواب:۔ سلامؔ مچھلی شہری اس وقت میرا خیال ہے کہ لکھنؤ میں تھے اس وقت وہاں بزرگ اساتذہ کا زور تھا۔سلامؔ مچھلی شہر کی شہرت تو بعد کی ہے جب وہ باقاعدہ ریڈیو سے وابستہ ہوئے ۔مچھلی شہر سے ان کا آنا جانا کم تھا ان کے چھوٹے بھائی احتشام وہ ہمارے کلاس فیلو تھے لیکن ان کے گھر سے روابط ذرا کم تھے اس لیے مچھلی شہر میں ان کی رسائی اور نام وشہرت سے تو لوگ بعد میں واقف ہوئے لیکن بعد میں اس پر لوگوں کو فخر ہوا کہ مچھلی شہر کے کسی شخص کو پدم شری کا ایوارڈ ملا جو باعث فخر بات سمجھی جاتی تھی۔

سوال:۔ جی جی ظاہر ہے یہ مستقل موضوع ہے میں یہ جاننا چاہ رہا ہوں انٹرمیڈیٹ کے لیے گورکھپور گئے لیکن اس سے پہلے جس زمانے کا ہم ذکر کررہے ہیں وہ ادبی روایتیں بہت مستحکم تھیں اب نہ وہ مشاعرے ہیں نہ مذاکرے ہیں نہ وہ شعراء نہ شعراء کی محفلیں تو منظر نامہ تبدیل ہو چکا ہے لیکن آپ کے بچپن میں شعروسخن کا منظر نامہ کیا تھا جہاں آپ موجود تھے۔

جواب:۔ ۱۹۵۱ء میں مڈل اسکول میں داخل ہوا۔یعنی چھٹے درجے میں ،مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر مظہر صاحب تھے بڑے خوبصورت وجیہہ بدن کے آدمی تھے انہیں شاعری سے

شغف تھا شعر کہتے تھے دوسرے استاد تھے مولوی عبدالرحیم صاحب بڑے سخت گیر تھے وہ بھی شاعر تھے واصف تخلص تھا۔ مڈل اسکول میں ایک مولوی عبداللطیف صاحب ہوا کرتے تھے جو کراکت کے رہنے والے تھے۔ ان کا تبادلہ ہوا تو یہاں آ گئے ان کو شعر وشاعری سے کوئی شغف نہیں تھا پورے شہر میں سروش مچھلی شہری کا بڑا ذکر ہوا کرتا تھا وہ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے اور شہیر مچھلی کے داماد بھی تھے ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا تھا ان کا ایک گروپ تھا۔ غالب کے شاگرد عبدالرزاق شاکر مچھلی شہری کے تلامذہ کے آثار نہ تھے۔ ایک حلقہ عبداللہ صاحب کا تھا وہ اقبال کے انداز میں شعر کہتے تھے یہ محمد عمر جعفری مرحوم کے گھرانے کے تھے بڑے ذی علم تھے زندگی میں کوئی کام نہیں کیا شاعری کرتے رہے زمینداری سے کسب معاش کرتے رہے ان کے کلام میں اقبال کا آہنگ بہت نکھر کے آتا تھا۔ متین مچھلی شہری کا یہ آخری زمانہ تھا یہ بھی نوح ناروی سلسلۂ داغ سے تھے لیکن داغ کی روایت کا یعنی ان کے لب ولہجہ کی پاسداری نہیں تھی وجہ یہ تھی کہ مچھلی شہر کی جو فضا تھی اس میں ایک مشترکہ کلچر تھا۔ آپ سن کر حیرت کریں گے کہ گاؤں کے لوگ بھی شعر کہہ لیا کرتے تھے تک بندی کر کے ظریف نے گاؤں کے مشاعرہ کا منظر لکھا ہے کسی نے چار شعر کہہ لیے شاعر ہو گیا۔ بفضلہٖ تعالیٰ وہ روایت موجود ہے ہمارے پڑوس میں ایک صاحب بالکل ناخواندہ ہیں لیکن تک بندی کر کے شعر کہتے ہیں اکثر مجھ سے کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب شعر سن لیجئے اب انہوں نے اپنی زبان میں غلط لہجے کے ساتھ تک بندی کی ..... کہیں کہیں وزن نہیں ہے۔ گاؤں میں ایک رواج تھا برہا کا جو ہندی زبان میں بہت سے لوگ سمجھتے ہوں گے برہا کا رواج تھا اور گرمیوں کے موسم میں رات میں برہا گانے کا بڑا چلن تھا گاؤں گاؤں اس کے کچھ ماہرین ہوتے تھے ان کی ٹولیاں ہوتی تھیں دوسرے گاؤں سے مقابلہ آرائی بھی ہوتی تھی ایسے ہی ساون کے میلے میں بھی ساونی ہی کا میلہ ہوتا تھا اور اس میں بھی گروپ میں مقابلہ ہوتا تھا لگتا تھا عرب کی سرزمین کے قبیلوں کی شاعری کا منظر دیکھنے میں آتا تھا اور کسی نہ کسی استاد سے وابستگی ہوتی ہے۔ میں آپ سے عرض کروں گا آج بھی ربیع الاول کا جو جلوس نکلتا ہے اس میں مختلف اساتذہ کا کلام پڑھا جاتا

۔عبرتؔ مچھلی شہری ابھی بقید حیات ہیں ایک گروہ ان کی قیادت میں آگے آگے چلتا ہے۔

سوال:۔ یہ بہت دلچسپ باتیں ہیں ظاہر ہے ہم نے لوگوں سے بہت کم سنی ہیں اس کا ذکر کم ہوتا ہے نئی نسل تو واقف نہیں ہے میں چاہتا ہوں اس پر کچھ اور روشنی ڈالیں!

جواب:۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے بہت خیال افروز بات کو چھیڑنے کا اور مجھے ورغلانے کا ایک نسخہ تیار کیا بہت ہی یاد آتی ہیں وہ محفلیں جہاں اس طرح کی ہنگامہ آرائی ہوتی تھی میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا اسکول میں بیت بازی کا ایک ایسا سلسلہ تھا کلاس میں دو صفوں میں بچے بیٹھتے تھے اس میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے شعر یاد کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ ڈال پہ ٹوٹے ٹ پہ ٹوٹے تا کہ اس کا کوئی جواب نہ مل سکے۔ظاہر ہے ہم اس وقت درجہ ۳ اور ۴ کے طالب علم تھے تو مختلف کتابوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کے ایسے اشعار لائے جاتے تھے دس دن تک شہر کے مختلف علاقوں میں عاشورہ کی محفلیں ہوتیں۔مجلس خوانی کا دس دن تک اہتمام ہوتا۔گاؤں گاؤں میں میلاد شریف پڑھا جاتا۔آپ سے عرض کروں میرے گاؤں میں کوئی ہفتہ نہیں گزرتا تھا جس میں میلاد شریف نہیں ہوتا مختلف بہانوں سے کوئی مہمان آ گیا باہر سے پردیسی آ گئے جو بھی پردیسی آتا میلاد ضرور ہوتا تھا میرے گاؤں کی بڑی آبادی 75% جو باہر کام کرنے والے ہیں بمبئی اور احمد آباد رہتے ہیں باقی کچھ حصہ کلکتہ یا دوسرے علاقوں میں تو ان کا معمول تھا گویا آنے کے بعد ایک میلاد شریف کی محفل منعقد ہوتی۔اس کی ایک سماجی حیثیت ہوتی تھی گاؤں کے سارے لوگ مل بیٹھتے تھے ان کو کھانے پر مدعو کیا جاتا تھا بہانہ میلاد شریف کا ہوتا لیکن گاؤں کے بڑے بزرگ اور نوجوان لڑکے بچے نہیں ان کو مدعو کیا جاتا وہ اس میں بیٹھتے تھے گاؤں کے مولوی صاحب میلاد شریف پڑھتے معاف کیجئے گا میری اردو درست جو ہوئی میلاد شریف میں شرکت اور میلاد شریف پڑھنے سے۔تھوڑی اردو جب آنے لگی ہائی اسکول تک اردو تھوڑی بہتر ہوگئی تو اب بزرگوں نے میلاد اکبر کو مجھ سے پڑھوانا شروع کیا میلاد اکبر پڑھتے پڑھتے اردو سے شوق بڑھ گیا۔مجھے اگرچہ آج تک شعر کہنے کی توفیق نہیں ہوئی لیکن زبان کی جو درستگی ہے وہ ان میلاد کی محفلوں میں بیٹھنے اور سننے سنانے کی وجہ سے ہے بعد میں، آپ کو سن کر حیرت ہوگی

کہ میں جمعہ کی نماز کا خطیب بھی ہو گیا ابھی عمر تو سولہ سال کی رہی ہو گی لیکن جو ہمارے امام تھے گاؤں کے زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے وہ بزرگ تھے نمازی تھے دین دار تھے لیکن خطبہ جو عربی میں ہوتا ہے صحیح طور سے نہیں پڑھ پاتے تھے میری عربی قرآن پڑھتے پڑھتے رواں ہو چکی تھی اور میں آپ سے عرض کروں کہ مجھے شروع سے ہی قرآن پڑھنے کا بڑا شوق رہا ہے آپ سے عرض کروں کہ ہم آپ ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اردو کی درستگی کے لیے قرآن نسخۂ شفا ہے قرآن پڑھنے والے کی اردو بہت اچھی ہو جاتی ہے اور ذرا ترجمہ تفسیر کے ساتھ پڑھا جائے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ ہم اردو اچھی بنا سکیں۔ مجھے خطبہ دینے کے لیے ظاہر ہے کہ اس خطبے کے آداب سے واقف تو نہیں تھا ایمان کی ہدایتوں سے بہت زیادہ واقف نہیں لیکن بہر حال خطبہ دینے کے لیے یہ پرورشِ زندگی اور علمی پرورش کا جو طریقہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس بستی اور دیار کے ماحول کی دین ہے میلاد شریف کی محفلوں میں چار لڑکوں کو کھڑا کر دیا گیا کہ نعت پڑھو جس کی آواز ذرا ٹھیک ٹھاک ہوئی بڑے بوڑھوں نے کہا ہاں بیٹے تم کو یہ نعت پڑھنی ہے یہ سلام پڑھتا ہے اور مجھے حیرت ہوتی تھی کہ حضرت بلالؓ کی اذان جو ایک مثنوی ہے ہر محفل میں واحد چچا پڑھتے تھے بہت خوش لحن تھے بہت اچھی آواز تھی لوگ بہ تاکیداً ان سے کہتے تھے آپ ہی پڑھیے تو اس کا اثر ہوتا تھا جو بچے ہیں نوجوان ہیں ان کی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی زبان اور شائستگی کی بھی بہت تربیت ہوا کرتی تھی۔ مچھلی شہر میں میں نے یہ ذکر کیا چہلم تک سلسلہ چلتا تھا بارہ وفات کا مہینہ آیا سلسلۂ نعت شروع ہو گیا ۱۲ دن تک ۱۵ دن تک ذکر رسالت مآبؐ ہو گا اور اس میں بیچ بیچ میں نعتیں بھی پڑھی جائیں گی کوئی ضروری نہیں ہے کہ نعت بہت ہی مرصع اور مروف ہوں مقامی شعرا کی بھی نعتیں بعض خوش لحن بچوں کو سکھا دیا جاتا تھا وہ پڑھتے تھے اور اس کے علاوہ میں ابھی آپ سے ذکر کر رہا تھا ساون کا مہینہ آیا ساون کے مہینے میں ظاہر ہے کہ یہ منظر بڑا دیدنی ہوتا ہے بارش ہوتی رہتی ساون میں بارش کا زمانہ ہوتا ہے تو ایک میلہ لگتا ہے اس میلے میں ساون کے گانے بھی اس میں بھی مقابلہ آرائی ہوا کرتی تھی اور ساون کے سارے گانوں کے جو تخلیق کار ہوتے تھے یہ اردو والے

مچھلی شہر کے اساتذہ ہوتے تھے کوئی دکان پر ہے تو کوئی گھڑی ساز ہے یہ لوگ شعر لکھ کر دیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا مقابلہ آرائی آج بھی شکر ہے کہ بارہ وفات کے جو جلوس نکلتے ہیں میں نے ابھی ذکر کیا تھا مختلف محلوں کے جلوس ہوتے ظاہر ہے کہ بیسوں محلے ہیں ان محلوں کے بچے منظّم طور پر یاد کر کے کئی کئی نعتیں پڑھتے ہیں آپ کو سن کر حیرت ہوگی چونکہ مچھلی شہر جونپور میں دونوں فرقوں میں محاذ آرائی کے سبب مرثیے بھی منظور شدہ ہیں تاکہ کسی کی دل آزاری نہ ہو خیر تو اس طرح کی محفلوں سے شہر کی فضا گونجتی۔ ظاہر ہے اب وہ معیار نہیں ہے مزے کی بات ہے کہ ان سب کا جو مرکز سخن ہے جونپور ہے جونپور صدر شہر ہے ضلعی شہر ہے مرکز جو ہے جونپور ہے۔ بڑا شہر ہے لاکھوں کی آبادی ہے تو یہاں مسلم آبادی کا تناسب بھی خاصا ہے اور یہاں خانقاہیں ہیں مدارس ہیں علماء کی محفلیں ہیں اور بہت سے مدارس ہیں، میں آپ سے عرض کروں کہ جونپور پورے ملک کا تنہا شہر ہے جہاں اس وقت چار پی جی کالج مسلمانوں کے ہیں ظاہر ہے اس میں اردو بھی ہے سائنس بھی ہے کسی بھی ضلعی شہر میں ہمارے تین کالج نہیں۔ کشمیر میں ہوں تو ہوں کیوں کہ وہاں تو ہونے ہی چاہئے لیکن ہندوستان کے کسی ضلعی شہر میں مسلمانوں کے اتنے ادارے نہیں۔ آپ اندازہ لگائیں ادھر دس سال کے اندر کئی سینئر سکنڈری اسکول اور ہائی اسکول نرسری اسکول ہمارے حلقے کے قائم کردہ ہیں، میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس دیار میں اعظم گڑھ ہے مدرسۂ اصلاح اور مدرسہ فلاح جیسا ادارہ ہندوستان میں آپ ندوہ اور دیوبند کو چھوڑ دیں کہیں نہیں ہے اسی طرح سے میں اب شبلی کالج کا ذکر کروں، شبلی کالج جیسا کالج میں نے تو ایک مضمون میں لکھا ہے کہ علی گڑھ سے لے کر ڈھاکہ تک اس 2000 کلومیٹر کے فاصلے میں اتنا بڑا کوئی مسلم ادارہ نہیں ہے جیسا شبلی کالج ہے تو یہ آپ نے جو ذکر چھیڑا ہے یہ اسی روایت کی .... علمی روایت کا ایک حصہ ہے۔ جون پور میں مدرسۂ حسینہ اور گورینی کا مدرسہ شان دار علمی ادارے ہیں۔

سوال:۔ بالکل صحیح آپ نے فرمایا قرآن مجید کا کوئی نسخہ آپ کی تحویل میں ایسا ہے جس کی نقل دنیا کے کسی خطے میں موجود نہیں ظاہر یہ بہت دل چسپی کا موضوع ہے اور قرآن مجید

کے نسخوں سے دلچسپی رکھنے والے دنیا بھر کے افراد کے لیے یہ تجسس کا مقام ہے کہ وہ نسخہ کیا ہے اس کی معنویت کیا ہے کیسے وہ دوسرے نسخوں سے ممتاز ہے اور اس نسخے کا تعلق کہاں سے ہے تو ذرا چونکہ جونپور کا ذکر آیا۔ وہاں کی لائبریری کا ذکر آیا تو میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ شاید یہ سلسلہ ملتا ہو تو ذرا اس نسخے کی بازیافت آپ نے کیسے کی اور وہ نسخہ کیا ہے ذرا اس کا بھی ذکر ہو جائے۔

جواب:۔ڈاکٹر صاحب آپ نے تو میرے شوق کو آواز دی ہے اور اگر آپ نے یا ڈاکٹر سالم سلیم نے اشارہ کیا ہوتا تو میں کچھ اوراق لاتا یہاں دکھانے کے لیے اگر یہ ممکن ہوتا آپ اندازہ لگائیں کہ آپ نے جس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے اس نے میری زندگی اور مطالعے کا رُخ بدل دیا آپ جانتے ہیں کہ اقبالؔ میرے رگ و پے میں روحِ روانِ خون ہیں اور اس پر مجھے فخر بے جا بھی ہے اور اس کا جواز بھی ہے لیکن آپ نے اشارہ کیا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے اقبالؔ سے ہم کیسے تحقیق کی طرف چلے گئے ظاہر ہے اقبالؔ عہد جدید کا عظیم فنکار شاعر اور فلسفی ہے لیکن ہم نے کیسے مراجعت کی کلاسکی ادب کی خط شناسی کی طرف یہ جونپور کا اور صرف جونپور کا فیضان ہے جس نے مجھے مجبور کیا کہ ابھی آپ نے مجھ سے قرآن کا ذکر کیا میں آپ سے ذکر کر رہا ہوں تذکرۂ الٰہی کا جسے میں نے ۳ جلدوں میں شائع کیا اور حکومتِ ہند کا شکر گزار ہوں کہ اس نے کثیر رقم کی معاونت کی میں نے شائع کیا دنیا کا واحد نسخہ فارسی کا دوسرا تذکرہ یعنی لباب الباب کے بعد یہ دوسرا تذکرہ ہے جو شاہ جہاں کے زمانے میں گویا 1065ھ میں لکھا گیا یہ دنیا کا پہلا اور آخری نسخہ ہے تقریباً تیس سال مجھے تلاش کرنے میں لگے کہ دنیا میں کوئی اور نسخہ تو نہیں ہے بیشتر لائبریریوں کے کیٹ لاگ دیکھ ڈالے کہیں اس کا ذکر نہیں ملا لیکن اتفاق سے مچھلی شہر میں ہی مولانا جعفری کے کتب خانے سے یہ نسخہ ملا اور آپ کو ڈاکٹر صاحب حیرت ہوگی میں تو قربان جاتا ہوں ان بزرگوں پر اسی کتب خانے میں حدیث پاک کا دنیا کا واحد نسخہ جو کہیں نہیں تھا امام بخاری کے دادا استاد کا نسخہ المصنف کا اتنا پرانا قدیم ترین نسخہ یہاں موجود تھا اور وہ جہازی سائز میں جلدوں میں اللہ بھلا کرے کہ مولانا حبیب الرحمٰن نعمانی مرحوم کا جنہوں نے اعظم

گڑھ سے آ کے اس نسخے کو سات جلدوں میں مرتب کیا اور بیروت اکیڈمی نے اسے شائع کیا۔ ابھی میں نے آپ کے نام کی رعایت سے ذکر کیا بھلا ہو آپ کا زندہ وسلامت رہیں تفسیر رشیدی کا ذکر کیا تھا مولانا رشیدی کا جو کتب خانہ ہے ان کی خانقاہ، خانقاہِ رشیدیہ کہلاتی ہے جونپور کے قلب میں ہی یہ خانقاہ ہے وہیں سے میرے استاد پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے دیوان حافظ کا دنیا کا قدیم ترین نسخہ برآمد کیا۔ پروفیسر محمود الٰہی صاحب بھی گرمیوں کی چھٹی میں گورکھپور سے آتے کتب خانہ رشیدیہ کے مہمان خانے میں قیام کرتے تھے اور مزے کی بات یہ ہے یہ کتب خانہ عاشورہ کے دس دن تک کھلتا تھا باقی سال بھر بند رہتا تھا.... کسی کو اجازت نہیں ملتی اجازت ہو بھی تو عاشورہ میں کون آتا اور دیکھنا مشکل تھا ۔ میں جونپور کا رہنے والا تھا تو مجھے بھی بلا لیا کرتے تھے میں کتابوں کی جھاڑ پونچھ کرتا تھا مخطوطات کو دیکھتے تھے یہیں پر انہیں دیوان حافظ ملا یہ ان کی دیانتداری تھی پروفیسر محمود الٰہی صاحب نے کہا کہ عبدالحق صاحب یہ میرا موضوع نہیں ہے یہ فارسی کا مخطوطہ ہے جب کہ وہ اس زمانے میں اردو کے تمام ہندوستانی اساتذہ کے مقابلے میں ان کی فارسی ان کی عربی بہت اچھی تھی چاہے وہ پروفیسر سرور صاحب ہوں یا وہ خواجہ احمد فاروقی صاحب ہوں یہ ان کی علمی دیانتداری تھی کہ انھوں نے یہ نایاب نسخہ پروفیسر نذیر احمد صاحب جو علی گڑھ میں تھے ان کے حوالے کیا پروفیسر نذیر احمد صاحب نے پھر اسے مرتب کر کے شائع کیا اور شاہ ایران کی جیب خاص سے وہ نسخہ شائع ہوا، جونپور جناب وہ شہر ہے میں آپ سے عرض کروں قرآن پاک کے اوراق اسی مچھلی شہر کے کتب خانے کی دین ہیں میں نہیں سمجھتا تھا میں نہیں جانتا تھا اس کی کیا قدر و قیمت ہے دہلی آیا تو اندازہ ہوا مخطوطہ کیا چیز ہوتا ہے اچھا اسی زمانے میں 1970ء میں یہاں دہلی یونیورسٹی میں پہلی بار مخطوطہ شناسی کا کورس بھی شروع ہوا پہلے سال تو میں اس کا طالب علم رہا اور شبیر احمد خاں غوری مجھے ان پر ناز ہے جیسے عالم نے پڑھایا ہے جب فارغ ہوا تو مجھے اتفاق سے یہی کورس پڑھانے کے لیے استاد مقرر کیا گیا، مخطوطہ شناسی گویا میری ذمہ داری اور فرائض منصبی میں شامل تھا اب مخطوطات سے دل چسپی بڑھی جب گرمیوں کی چھٹی میں گاؤں جاتا۔ مجھے آج بھی یاد ہے 16 جون

1970ءکومولانا عمر جعفری کے کتب خانے میں پہلی بار داخل ہوا مولانا نے مجھے نہیں دیکھا تھا میں ان سے واقف تھا لیکن وہ مجھے نہیں جانتے تھے کہ گاؤں کا ایک لڑکا ہے لیکن جب انھوں نے سنا کہ دہلی یونیورسٹی سے کوئی آیا ہے تو انہوں نے اجازت دی کئی دنوں بعد وہاں میں نے یہ اوراق دیکھے ابھی میں نے تذکرے کا ذکر کیا تھا تذکرہ الٰہی کا وہیں پر مجھے دیوان شاکر ناجی کا بھی مخطوطہ ملا اس وقت ڈاکٹر فضل الحق صاحب کام کر رہے تھے دیوان شائع ہو چکا تھا اس لیے وہ کام نہیں آسکا پھر اسی نسخے پر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی بیگم صاحبہ نے پی۔ایچ ڈی حاصل کیا اور وہ نسخہ میں نے ظہیر صاحب کو پیش کیا۔ڈاکٹر ظہیر احمد صاحب میرے رفیق کار بھی تھے اور صدر شعبہ بھی تھے لیکن وہ مخطوطہ دوبارہ مجھے نہیں مل سکا جس کے بارے میں ہماری آپ کی بات بھی ہوئی تھی..... یہ قرآن پاک کا نسخہ بھی مجھے وہیں ملا یہاں مدتوں تلاش میں تھا کس خط میں ہے اس لیے کہ اس میں بہت وقت لگا اس میں جو آئتیں ہیں وہ کہاں سے ہیں بعد میں پتا چلا جب میں نے بہت غور سے دیکھا کہ سورۂ نور کی کچھ آیتیں ہیں پورا قرآن نہ سہی لیکن کچھ حصے اس میں ہیں اب اس خط کی شناخت کے لیے مجھے تلاش تھی کہ کون سا خط ہے مجھے اندازہ لگ رہا تھا کہ یہ خط کوفی ہے اس لیے کہ اس کی تحریر اور انداز کتابت جو ہے خط کوفی ہے مجھے تھوڑی تشویش ہوئی تو پاکستان کے ایران کے ترکی کے قاہرہ کے بھی ماہرین کو اس کی نقل بھیجی تو سب نے بہ اتفاق کہا کہ بہت قدیم نسخہ ہے اور چوتھی صدی ہجری آخر کا ہے یا زیادہ سے زیادہ پانچویں صدی ہجری کے اوائل کا نسخہ ہے اس لیے کہ اسی دور تک یہ خط رائج تھا اور یہ خط کوفی بہ انداز کوفی ہے لیکن اندلسی کوفی ہے اب اس میں مسئلہ پیدا ہو گیا اگر اندلسی خط کوفی ہے تو یہ گویا عرب کی سرزمین سے باہر اسپین میں اس کی کتابت ہوئی ہے اچھا اسی زمانے میں، میں آپ سے عرض کروں کہ مچھلی شہر کے کتب خانے میں چوتھی صدی ہجری کا ایک عربی مخطوطہ اندلس کا لکھا ہوا اسی ذخیرے میں تھا لیکن وہ پتا نہیں کہاں ناپید ہو گیا میں سمجھتا ہوں کہ سب سے قیمتی سرمایہ تھا مچھلی شہر کے اس کتب خانے کا ابھی میں نے اپنی کتاب 'سوز و گدازِ زندگی ' مولانا عمر جعفری کے نام سے منسوب کی ہے کہ مرحوم بڑی شفقت فرماتے انہوں نے مجھے

آزادی دی تھی لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ بہت زیادہ فائدہ حاصل نہیں کر سکا اس لیے کہ جب استفادہ کا وقت آیا تو مولانا دنیا سے رخصت ہو گئے ۔مولانا مرحوم نے سارا ذخیرہ ہمدرد دواخانے نئی دہلی کو منتقل کر دیا۔ وہ شیرازہ منتشر ہو گیا لیکن میرا اب بھی یقین ہے کہ ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا کہ اردو میں بارہ ماسے کی روایت ہے پوری ہندوستانی شاعری میں یعنی ہندی میں سنسکرت میں بھی بارہ ماسے کی روایت ہے تیرہ ماسے کی کوئی روایت نہیں لیکن اردو میں ایک شخص تیرا ماسہ لکھتا ہے قبطی جو یہیں روہتک کا رہنے والا ہے دہلی کے قریب کا اس نے تیرہ ماسہ لکھا یہ ہندی والوں کو بھی حیرت ہے گورنمنٹ آف انڈیا نے جب اسے شائع کیا تو ہندی والوں کا تقاضا بڑھا کہ اس اردو کے مخطوطے کو ہندی میں بھی منتقل کیا جائے تو ہندی میں بھی وہ شائع ہوا ہے بارہ ماسے کے خلاف یہ اردو والوں کا ذہن ہے یہ اردو والوں کی شناخت ہے کہ انہوں نے تیرہ ماسے کی روایت بھی قائم کی ۔کس قدر زرخیز یہ علاقہ تھا نہ محض تہذیب وعلم کے اعتبار سے بلکہ ذخیرۂ علم وکتب کے اعتبار سے بھی اس کا کوئی ثانی نہیں ہے، میں عرض کر رہا تھا یہ جو قرآن پاک کے اوراق ہیں بہر حال بیرون ملک اس کی قدر افزائی ہوئی ہے یہ ایک ہی نہیں میں ابھی آپ سے ذکر کر رہا تھا اندازہ لگائیں کہ اعظم گڑھ کے کتب خانے دارالمصنفین میں قدیم نسخے ابھی محفوظ ہیں ابھی مزید کام کرنے کی ضرورت ہے ۔ بڑے قیمتی مخطوطے موجود ہیں اور کتب خانہ رشیدیہ کا تھوڑا سا حصہ دیکھا ابھی بہت باقی ہے جونپور کا ایک جو سب سے زرخیز علاقہ ظفر آباد ہے ایک چھوٹا سا ٹاؤن بازار ہے ۔ باقیات رہ گئے ہیں یہاں صوفیوں کا کوئی ایسا سلسلہ نہیں ہے جو جونپور میں نہ ہو یعنی چشتیہ قادریہ، سہروردیہ اور مداریہ اور کیا اور کیا سارے سلسلے اور سارے قبیلے یہاں موجود ہیں اور عمارات کو آپ دیکھیے یہ جامع مسجد اس شان کی اس دور کی مسجد کوئی ہندوستان میں نہیں ہے اٹالہ مسجد بھی اس دور کی فن تعمیر کا عالیشان نقش ونگار ہے اور دریائے گومتی کے کنارے ایک چھوٹی سی جھروکے والی مسجد کہلاتی ہے اس مسجد کی جالیوں کا جواب میں نے احمد آباد کی جالی والی مسجد میں نہیں دیکھا کہ سنگ مرمر کی سلوں پر اتنا باریک اور خوبصورت کٹ ورک مجھے دیکھنے کو نہیں ملا جو

جھروکے کی مسجد گومتی کے کنارے جونپور شہر میں ہے اور میں آپ سے عرض کروں کہ ایک پہلو اور بھی قابلِ ذکر ہے آپ کی محفل میں اسے بھی محفوظ کر دوں کہ جونپور خوشبوؤں کا شہر ہے یہ علمی خوشبو نہیں ادبی بھی نہیں بلکہ عطر و عنبر کی خوشبو سے یہ شہر بسایا گیا ہے اور میں ابھی ذکر کر رہا تھا گومتی ندی کا اب ذرا دیکھیے قدرت نے کیا تخصیص پیدا کی ہے کہ گومتی ندی درمیان شہر سے بہتی ہے بعض لوگ کہتے ہیں جیسے لندن میں دریائے ٹیمبز بیچ شہر سے گزرتی ہے تو جونپور میں بھی یہ ندی گزرتی ہے اور یہ رحیم خان خاناں کا بنوایا ہوا پل بھی ہے ابھی تک رحیم خان خاناں کے دوہے لکھے ہوئے ہیں۔ اب سوچئے رحیم خان خانان کبیر کا پورا کلام ڈاکٹر ہزاری پرساد دیویدی جو کبیر کے کارشناس ہیں کبیر سنگرہ میں یہ پورے علاقے کا فیضان ہے۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ گیتا کی تفسیر بھی بنارس میں لکھی گئی۔ شنکر آچاریہ نے لکھی جو کیرل کے رہنے والے ہیں کیرل سے ہجرت کر کے کاشی آئے اور بعد میں کاشی سے بھی ہجرت کر کے کشمیر تک گئے کشمیر میں ابھی جو ایک چوٹی ہے ڈل جھیل کے کنارے تو انھوں نے گیتا کی اور غالباً پہلی تفسیر وہیں لکھی گئی جس کا ذکر علامہ اقبال نے ''اسرارِ خودی'' کے مقدمے میں کیا ہے آپ یہ دیکھیے علامہ اقبال پہلے شاعر اور مفکر ہیں جنھوں نے شنکر آچاریہ کا اور گیتا کا ذکر اپنی پہلی شاعری اور فلسفیانہ شاعری کے پہلے مجموعے یعنی ''اسرارِ خودی'' کے مقدمے 1915ء میں کیا ہے آپ اندازہ لگائیں کہ اردو کی روایت ہے اور اردو کی یہ قلندری ہے یہ کشادہ دلی ہے۔ یہ بھی سنا دوں آپ کو یہ روایت تھی اس علاقے کی جب ہندوؤں کے ایک طبقے نے تلسی داس کو نہیں پسند کیا ان پر لعن طعن کرنا شروع کیا ان کی تنقید کرنی شروع کی تو تلسی داس نے رامائن میں یہ لکھا کہ ''مانگ کے کھئیبو مسیت سوسوئبوں'' ہمارا یہ کیا کریں گے ہم مانگ کر کھالیں گے اور مسجد میں جا کے سو لیں گے یہ روایت تھی یہ روایت پدماوت کی تھی یہی روایت ہے مسجدیں کھلی رہتی تھیں سب کے لیے یہ دردِ دل کی کشادگی تھی۔ یہ روایتیں اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں اور ابھی مولانا ظفر احمد صدیقی کا انتقال ہوا ہے جو جون پور کے بڑے عالم بڑے بزرگ اور بڑے ذی علم تھے ان کی مریدی اور پیری کا سلسلہ مغربی بنگال کیا بلکہ برما تک ان کے مرید تھے

، جونپور کے اس علمی گھرانے میں ایک محلّہ ہے جو ملاٹولہ کہلاتا ہے ان کا کام صرف تبلیغ دین تھا علماء سے پورا محلّہ آباد ہے ان کے ہزاروں نہیں لاکھوں مریدین کی تعداد ہے جو مولانا کے انتقال پر آئے شہر میں کبھی ایسا مجمع نہیں دیکھا گیا جو جونپور میں ان کی تدفین کے وقت جمع تھا، مفتیوں اور قاضیوں کے محلے بھی اس دیار میں آباد ہیں۔

سوال:۔ ہندوستان تقسیم ہوا ہے 1947ء میں اس وقت آپ کی عمر غالباً آٹھ نو برس کی رہی ہوگی اور ظاہر ہے آٹھ نو برس کی عمر کی یادداشت تو اس عمر میں بہت ہی پختہ تو نہیں ہوسکتی لیکن کچھ جو جھلکیاں ہیں کچھ باتیں تو یاد آتی ہوں گی۔

جواب:۔ ڈاکٹر صاحب کچھ باتیں یاد آتی ہیں اور بہت ستاتی ہیں۔ میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا تھا کہ ہم گاؤں کے لوگوں کو محسوس ہی نہیں ہوا کب ملک تقسیم ہوا اور کبھی نہ کوئی لیڈر گاؤں میں آیا اور نہ کبھی اس طرح کی کوئی بات ہوئی ملی جلی آبادی اور ان کے آداب واطوار بھی اور ان کے رسومات بھی بالکل ایسا اختلاط کہ سوائے کبھی کبھی پوشش یا پوشاک سے نظر آتا امتیاز قائم ہوتا یا کبھی کبھی مذہبی رسومات میں ملک کب تقسیم ہوا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا ایک دن صبح مولوی صاحب نے اپنی ہی کاپی سے ایک ورق پھاڑ کر انہوں نے سرکنڈے کے جھنڈے بنا دیے اور وہ لے کر ہم لوگ گاؤں میں گھومے اس دن ہمیں کوئی مٹھائی بھی نہیں ملی کہ آج ملک آزاد ہوا ہے اس خوشی میں ایک لڈّو ملے یہ بھی نہیں ہوا بس یہ ہوا تھوڑی دیر کے بعد چھٹی ہوگئی اور گھر چلے گئے آبادی میں جو اختلاط تھا اس میں فرق نہیں آیا اور نہ کبھی دونوں ملکوں کے مابین جو عداوتیں شروع ہوئیں اس کا کبھی احساس ہوا دھیرے دھیرے سیاسی بھونچال شروع ہوا آپ اندازہ لگائیں کہ 1947 میں ملک آزاد ہوا اور 1952 میں ہمارا آئین مرتب ہوا 1952ء تک کوئی الیکشن نہیں کوئی پارٹی اور کوئی ایسا سیاسی کاروبار بھی نہیں 1952ء میں پہلا الیکشن ہوا۔ مچھلی شہر ملک کے پہلے وزیراعظم کا انتخابی حلقہ تھا ہم لوگ گاؤں سے مچھلی شہر روزانہ بستہ باندھ کر پیدل آتے جاتے تھے تھوڑا سا شعور ہوا جب معلوم ہوا کہ راستے میں مچھلی شہر سے تھوڑے فاصلے پر ہمارے گاؤں اور مچھلی شہر کے درمیان کھیتوں میں ایک جگہ کچھ ٹیلا سا بنا ہے ایک چبوترا سا

بنا ہے پوچھنے پر معلوم ہوا پنڈت نہرو آنے والے ہیں اور الیکشن ہونے والا ہے اور ان کے الیکشن کی تقریر ہوگی تو خیر پنڈت نہرو اس زمانے میں خاصے متعارف ہو چکے تھے ذہن وشعور میں بھی ملک کا کچھ نظام سمجھ میں آتا ہے آج تک وہ جہاں چھوٹا سا چبوترا بنا تھا جہاں پنڈت نہرو نے کھڑے ہو کر تقریر کی تھی وہ جواہر اڈا کہلاتا ہے الیکشن کی دھوم دھام تھی آپ کو یاد ہوگا جو پہلا الیکشن تھا اس میں کانگریس پارٹی کا انتخابی نشان تھا بیلوں کی جوڑی اب بیلوں کی جوڑی پر جو گانا بنا تھا وہ آج بھی یاد ہے ''اوٹوا دیو بیل کی پٹیا نائے مورے ہری کے لال'' ظاہر ہے یہ مقامی زبان میں تھا ملک کا جو انتظامیہ تھا اس کی کارکردگی سے لگا کہ تبدیلی آرہی ہے اور ملک میں آزادی کا خروشِ احساس بڑھنے لگا، گاؤں گاؤں میں اس کی خبریں بھی آنے لگیں کہ ملک آزاد ہو گیا لیکن آزادی کی جو سب سے مکروہ صورت تھی وہ فسادات کی خبریں ملک کے بٹوارے کے بعد آنے لگیں اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ نقل مکانی کا جو بڑا حادثہ ہوا دہلی اور نواح دہلی تک یا بہار و بنگال کے حصے میں جو قریب تھے وہ حادثے کا شکار ہوئے۔ سرحد سے ہم جتنے دور ہوتے گئے جو اختلاط تھا فکر میں بھی رسم ورواج میں بھی اس اعتبار سے بھی لوگوں نے توجہ نہیں دی۔ ملی جلی آبادی تھی ملا جلا کاروبار تھا اس اعتبار سے بھی لوگوں نے اس پر ذرا توجہ نہیں دی وہی آبادی تھی ملا جلا کاروبار تھا کھیت وہی کھلیان وہی کاشتکاری وہی آبادی میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔

ایسا کوئی سیاسی شعور نہیں تھا کہ لوگ منتقل ہوں ہاں بعد میں اکّا دُکّا لوگ منتقل ہوئے 1952ء کے بعد کچھ لوگ منتقل ہوئے مچھلی شہر کے کچھ لوگ کچھ گھرانے منتقل ہوئے باقی جیسے شہر تھا ویسے ہی شہر ہے جیسے گاؤں گا تھا ویسے گاؤں رہے ہاں بعد میں بتدریج یہ صورت حال خراب ہوتی رہی تو آج.....معاف کیجئے گا ایک دوسری صورتِ حال ہے۔

سوال:۔ ظاہر ہے منظر نامہ کافی تبدیل ہو چکا ہے ذرا اب گورکھپور کی طرف چلتے ہیں گورکھپور انٹرمیڈیٹ گریجویشن پی۔ ایچ ڈی تک آپ وہاں رہے اور اچھے اساتذہ بھی ملے خاص کر محمود الٰہی صاحب یہ گورکھپور کا منظر نامہ اس گفتگو میں روشن ہو جائے تو بہتر ہو۔

جواب:۔ ڈاکٹر صاحب یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ عمر کا جو عزیز ترین حصہ ہے وہ گورکھپور میں گزرا گورکھپور میں تقریباً تیرہ برس رہنے کا اتفاق ہوا۔ بقول ریاضؔ

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے

گورکھپور بڑی حسرت سے یاد آتا گورکھپور کا ماحول جونپور کے ماحول سے تھوڑا سا الگ تھا۔ الگ ان معنوں میں کہ گورکھپور کی وہ روایت نہیں تھی جو علمی و ادبی روایت جون پور کی تھی حالانکہ یہاں فراقؔ صاحب کی نسبت اسی شہر سے ہے۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی میں تھے مجنوں گورکھپوری ہی لے دے کے تھے ان کی ایک ادبی حیثیت تھی۔

سوال:۔ لیکن جب آپ گورکھپور گئے تو مجنوںؔ صاحب وہاں موجود تھے اور پڑھا رہے تھے؟

جواب:۔ مجنوںؔ صاحب وہاں موجود تھے ظاہر ہے انٹرمیڈیٹ کے لیے اسلامیہ کالج میں داخل ہوا چودھری جمیل صاحب پرنسپل تھے وہاں کے اساتذہ کا ابھی بعد میں ذکر کروں گا وہاں ایک مشہور کالج سینٹ اینڈریوز کالج ہے مجنوں صاحب انگریزی اور اردو پڑھاتے تھے اس زمانے میں کوئی ایسی تفریق نہیں ہوا کرتی تھی سہولت کی خاطر وہ انگریزی پڑھاتے اور اردو بھی پڑھاتے تھے 1958ء میں جب یونیورسٹی بنی تو شعبۂ اردو قائم ہوا۔ بی۔اے سال اوّل کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے کوئی اردو استاد نہیں تھا۔ تقاضا بڑھتا گیا تیرہ بچوں نے داخلہ لیا تھا۔ بی۔این جھا وائس چانسلر تھے بڑے معقول اور معتدل مزاج کے تھے انہوں نے اردو کی ضرورت محسوس کی اردو کی تقرری کا اشتہار دیا گیا۔ مجنوں صاحب نے بھی درخواست گزاری مجنوں صاحب کا انتخاب ہوا سرور صاحب سلیکشن کمیٹی میں شریک تھے مجنوں صاحب یونیورسٹی میں آ گئے مجنوں صاحب تین مہینے رہے ہوں گے کہ علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے آپ کو یاد ہوگا کہ غالب پر وہاں ایک پروجیکٹ تھا۔ تین مہینے تک مجنوں گورکھپوری نے اردو پڑھائی اور منظر یاد ہے کہ ہم لوگ ان سے متعارف ہوئے مجنوں صاحب بڑی منہنی سی شکل و شباہت بلکہ یوں کہیے جسے دھان پان کہتے ہیں شیروانی ان کے بدن کے عیوب چھپاتی تھی ہاتھ میں ایک چھڑی مگر آواز بڑی کڑک دار تھی۔

سوال:۔ ملک زادہ صاحب نے ان کے بارے میں ایک بار مجھ سے کہا تھا اسی سلسلے میں جب ہم نے ان سے بات چیت کی وہ چھٹا نک بھر کے شخص تھے لیکن پہاڑوں سے ٹکر لینے کی اہلیت رکھتے تھے۔

جواب:۔ اس میں کوئی شک نہیں ڈاکٹر صاحب میں آپ سے کہہ رہا ہوں زندگی میں ایسا پتلا دبلا اردو والا کیا عام انسانوں میں بھی نہیں دیکھا ایک ان کو دیکھا یا کراچی یونیورسٹی میں ڈاکٹر حسنی صاحب کو جنہوں نے اختر شیرانی پر کام کیا حسنی صاحب بھی ایسے ہی ہیں شیروانی پسلی کی ہڈیوں کو گننے سے بچا لیتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب میں یہ عرض کروں کہ پہلے دن کی کلاس میں انہوں نے اقبال کی 'خضر راہ' شروع کی اور یہ میں کسی مضمون میں لکھ چکا ہوں کتاب انہوں نے ہاتھ میں نہیں لی ان کی کتاب ابھی اقبال پر آ چکی تھی یہ سینٹ اینڈرز یو کالج میں دیئے گئے لکچر تھے اقبال پر پتلی سی کتاب تھی اقبال کے وہ بہت ثنا خواں نہیں تھے لیکن اقبال کی بعض باتوں کی بڑی تعریف کی ہے اقبال کی 'خضر راہ' کو انھوں نے زبانی پڑھائی اور شعر پڑھنے میں جو تمکنت تھی آواز میں جو کڑک تھی لگتا تھا کہ پورے کلاس روم کو مسحور کر رہی ہے خیر یہ سلسلہ ڈھائی مہینے تک رہا سلیکشن کمیٹی نے نمبر دو پر پروفیسر محمود الٰہی صاحب کو رکھا تھا اس زمانے میں وہ رام پور رضا ڈگری کالج میں تھے۔

سوال:۔ یعنی مجنوں گورکھپوری علی گڑھ آ گئے تو وہ جگہ خالی ہوئی۔

جواب: محمود الٰہی صاحب مجنوں صاحب کے بالکل مخالف ان معنوں میں کہ جسم و جاں بھی لباس پوشاک بھی اور اندازِ گفتگو بھی مجنوں صاحب ہمیشہ چوڑی دار پاجامہ اور سفید شیروانی زیب تن کرتے تھے سردیوں میں مجھے یاد ہے کہ ان کی شیروانی کا رنگ سفید آمیز کہئے بلکہ آف وائٹ جسے کہتے ہیں شیروانی پہنتے۔ اس زمانے میں گورکھپور یونیورسٹی کے اساتذہ میں بڑے بلا کے لوگ تھے۔ مختلف شعبے میں بڑے ذی علم لوگ تھے ظاہر ہے اردو بھی اس سے پیچھے نہیں تھی بلکہ اردو کا تو شہرہ مجنوں گورکھپوری کی وجہ سے تھا۔ محمود الٰہی صاحب آئے تو یہ چوڑی مہری کا پاجامہ ڈھیلی ڈھالی شیروانی اندازِ تدریس بھی مختلف تھا بہت ہی مشفقانہ بہت معصومانہ خطابت بھی نرم لہجے کی۔ مجنوں گورکھپوری سے ذرا فاصلہ تھا

ان کی ہیبت طاری تھی ان کی ہیبت کی وجہ سے وہ ربط ان سے شاگرد واستاد کا قائم نہیں ہوسکا لیکن محمود الٰہی صاحب کے یہاں یہ بات بالکل برعکس تھی ہر شاگرد یہ سمجھتا تھا کہ محمود الٰہی صاحب سے اس کے گویا دوستانہ مراسم ہیں تین سال تک گویا بی۔اے میں پڑھاتے رہے آخری سال یہ ہوا جب کورس بڑھا اور کلاس بڑھے تو ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب کا تقرر ہوا وہ ممتاز ہائر سیکنڈری لکھنؤ میں پڑھاتے تھے وہ اس زمانے میں پی۔ایچ ڈی ہو چکے تھے اور بہت ذی علم تھے شاید آپ جانتے ہوں وہ شاعر بھی تھے بے حد مشفق بڑے مہربان بہت ہی کم سخن اور کم آمیز تھے اس کے بعد ملک زادہ صاحب آئے باقاعدہ لیکچرر ہوئے لیکن یہ تو مشاعروں کے آدمی تھے ان کے آنے سے شعبے کی رونق بڑھ گئی رونق اس معنی میں بڑھ گئی کہ ایک ہجوم رہتا تھا ہندی کے اساتذہ کا ہندی کے شعراء کا اردو کے شعرا کا شہر کے لوگ بھی کسی نہ کسی بہانے جمع رہتے محمود الٰہی صاحب کو یہ بات ناگوار لگتی تھی کہ یہ شعبۂ اردو ہے یہ ہجوم عاشقاں کا شعبہ نہیں ہے یہ تدریس کا شعبہ ہے ملک زادہ صاحب کو بھی میں سمجھتا ہوں کہ گورکھپور راس نہیں آیا وہ شبلی کالج چھوڑ کے آئے تھے شبلی کالج کی اپنی ایک فضا تھی۔

سوال:۔ ملک زادہ منظور احمد گورکھپور میں کب تک رہے ہوں گے پھر تو لکھنؤ چلے گئے تھے؟

جواب:۔ میرے خیال میں تین چار سال رہے بہت مختصر رہے لکھنؤ میں ان کا تقرر ہوا وہ بھی ایک کہانی ہے یہاں ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب صدر شعبہ تھے خواجہ احمد فاروقی ایکسپرٹ ہو کے گئے تھے ان کا بیان یہ ہے کہ ملک زادہ منظور صاحب کے خلاف صدر شعبہ نے کچھ ایسی باتیں رکاوٹ کی رکھیں جو ذرا مناسب نہیں تھیں فاروقی صاحب نے ملک زادہ صاحب کی تائید کی اور شبیہ الحسن صاحب سے یہ کہا کہ بھائی مجھے ان کی ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں میں تو علم وفضل کے معیار پر بحیثیت ایک کارشناس کے ان کو جانتا ہوں اور اس وقت جتنے امیدوار ہیں وہ سب سے بہتر ہیں اردو کے ادیب وشاعر بھی ہیں مولانا آزاد پر ان کی کتاب بھی آ چکی تھی گورکھپور یونیورسٹی میں انہوں نے یہ مقالہ لکھا وہیں سے پی۔ایچ ڈی ہوئے تو خیر ان کا تقرر یہاں ہو گیا۔

سوال:۔ ان کے نگراں کون تھے؟

جواب:۔ محمود الٰہی صاحب ایں خانہ تمام آفتاب است۔ محمود الٰہی صاحب کی دین ہے ابھی میں کل ہی ایک صاحب سے ذکر کر رہا تھا کہ محمود الٰہی صاحب کی یہ خوبی تھی ڈاکٹر معید رشیدی جو میں نے اردو کے کسی استاد میں یہ بات نہیں پائی انہوں نے اپنے تمام طالب علموں کو جنہوں نے پی۔ ایچ ڈی کیا۔ عزت نفس کو بھی کچل کر انہوں نے اپنی حمیت اور غیرت کو بالائے طاق رکھ کے اپنے شاگردوں کے تقرر میں سفارش کی ہے اب آپ اندازہ لگائیں کہ ملک زادہ صاحب کو لکھنؤ لانے میں انہوں نے سفارش کی تھی حسن صاحب سے اور فاروقی صاحب سے بھی اچھا خیر وہ تو استاد تھے میرے لیے بھی سفارش کی تھی حسن صاحب سے۔

سوال:۔ خواجہ احمد فاروقی نے حسن صاحب کو خط لکھا حسن صاحب نے محمود الٰہی صاحب کو خط لکھا محمود الٰہی صاحب نے آپ کو بتایا کہ یہ سلسلہ ہے آپ جایئے تو دہلی اس طرح آپ کی آمد ہوئی بسلسلۂ ملازمت پی۔ ایچ ڈی کر چکے تھے آپ!

جواب:۔ دلّی تو میرے لیے ہنوز دور است بلکہ دور تر است تھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ دلّی پہنچیں گے بلکہ والد صاحب کو اس کی فکر نہیں تھی تم کچھ ہو جاؤ ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہاں تم گھر کو سنبھالو دیکھو ان کا مزاج بڑا قلندرانہ تھا وہ کہتے تھے دہلی آنے کے بعد بھی ان کی خواہش تھی کیا میاں وہاں آنا جانا لگائے ہو آؤ اتنی زمین ہے کھانے پینے کو اللہ دے رہا ہے یہ باغ سنبھالو اور کیا چاہئے۔ بقول اقبالؔ کے ان کی قلندری بھی سکندری سے کم نہ تھی وہ کہتے دو کرتا دو پاجامہ دو لنگی چاہئے زندگی گزارنے کے لیے اور کچھ سامان کھانے پینے کو ہو جائے تو کیا کہنا ایک بھینس پلی ہوئی ہے دودھ دہی کافی ہے دو چار بکریاں ہیں یہ قربانی میں کام آجاتی ہیں اور یہ چائے کے لیے بکری کا دودھ جب بھینس دودھ نہیں دیتی ہے تو کافی ہے اور یہ چار چھ مرغیاں ہیں یہی ہم لوگ کی پوری میراث ہے اور اسی پر ہمارا گزارا ہے۔ گاؤں کے سبھی لوگ یہی سوچتے تھے آپ کو اردو کی کہاوت یاد ہے کہ ''آدھی روٹی کھانا بنارس میں رہنا'' اگر آدھی روٹی بنارس میں ملے تو دوسرے شہروں کی دربدری کی

کیا ضرورت ہے۔ میں جب دہلی آیا تو آپ یقین مانیے کہ مجھے ان کی رفاقت کا اور دوری کا بڑا احساس ہوتا تھا خاص طور سے والدہ کی اور آپ سے میں یہ بھی عرض کروں کہ میں اردو کا پہلا استاد ہوں جو انتہائی کم عمری میں چار سال لیکچرر رہنے کے بعد کشمیر یونیورسٹی میں ریڈر ہو گیا۔ 1968ء میں یہاں لیکچرر ہوا 1973ء میں وہاں ریڈر ہو گیا اور شیخ عبداللہ اس زمانے میں وزیر اعلیٰ تھے اقبال پر سیمینار تھا انہوں نے یہ کہا کہ آپ یہاں آ جاؤ میں نے ان سے کہا میری دہلی بہت ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کی ریڈر شپ تین سال تک انتظار کرتی رہی اس کے بعد عاجز آ کے جگہ مشتہر کی تو دوسرا وہاں انتخاب ہوا۔ مجنوں گورکھپوری کا آپ نے ذکر کیا ظاہر ہے ایک بڑی شخصیت تھی ایک بڑی علمی وجاہت کے مالک تھے ان سے پڑھنے کے بعد اندازہ ہو کہ استاد کا منصب یہ ہوتا ہے اب وہ کلاس میں آئیں تو سنّاٹا اور دم بخود ہو کر کے کسی کو بولنے کی اجازت نہیں کسی کو کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں اچھا ان کی طرف سے نہیں بلکہ ان کی ہیبت ایسی طاری ہوئی تھی ان کے نام کی جو شہرت تھی ہم لوگ بی ۔اے کے طالب علم ان سے کیا سوال کریں وہ کیا جواب دیں خیر وہ چھڑی کے ساتھ آتے تھے اور پھر چلے جاتے تھے۔ انگریزی کے ایک استاد جی۔ پی۔ سنگھ تھے چھ فٹ کے آدمی اور اپنی تہذیب کے پاسدار تھے دھوتی کرتا پہنتے تھے سردی ہو گرمی ہو برسات ہو دھوتی کرتا ہی پہنتے کبھی کبھی وہ میز پر بیٹھ کے لکچر دیا کرتے تھے اور ایسے فرّاٹے کی انگریزی بولنے والا میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا اگرچہ تلفظ بہت ہی اچھا نہیں لیکن آدمی بے حد مخلص اور محمود الٰہی صاحب کے سچے پکے جگری دوستوں میں تھے شام کو روزانہ ٹہلنا دونوں کا معمول تھا۔ اب سوچیے کہ وہ انگریزی والے یہ اردو والے لیکن دونوں میں دلچسپ گفتگو ہوتی تھی ۔ڈاکٹر سلام صاحب آ گئے تو شعبے میں خاصی چہل پہل ہو گئی فضل الحق صاحب بستی میں خیر ہائی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ محمود الٰہی صاحب نے پی۔ ایچ ڈی کرایا تو پارٹ ٹائم انہیں بھی ڈپارٹمنٹ میں جگہ دی گئی اس طرح سے شعبے سے ایک تعلق رہا میں نے بھی 62 میں ایم۔ اے کرنے کے بعد پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لیا اور اقبال پر جس طرح میرا داخلہ ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ بہ مشکل تمام اقبال پہ کام کرنے کا موقع دیا گیا 65 میں ڈگری

حاصل ہوئی۔

سوال:۔ اور پھر اس کے بعد دہلی کا سفر شروع ہوتا ہے؟

جواب:۔ ابھی مجھے ڈگری بھی نہیں ملی تھی کہ بلاوا آ گیا فاروقی صاحب نے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا حسن صاحب سے گورکھپور میں ملاقات ہو چکی تھی۔

سوال:۔ کیا وہ آپ کے پی۔ایچ ڈی کے نگراں تھے؟

جواب:۔ نہیں نگراں تو محمود الٰہی صاحب تھے جو وہاں کے صدر شعبہ تھے۔

سوال:۔ وہ پی۔ایچ ڈی کے ممتحن تھے؟

جواب:۔ جی ہاں وہ اور مسعود صاحب تھے انہوں نے تھیسس کو دیکھنے کے بعد کوئی تاثر قائم کیا ہوگا دہلی میں ڈاکٹر شرافت حسین مرزا صاحب کو تین ماہ کی چھٹی پہ جانا تھا اب آپ دیکھیے اس زمانے کے استاد کو تین مہینے کی جگہ خالی نہ رہے پروفیسر فاروقی صاحب کی حکمت عملی تھی اللہ ان کی قبر کو روشن کرے تین مہینے کے لیے وہ جگہ خالی نہ رہ سکے تین مہینے کے لیے فضل الحق صاحب کو بلایا اور تین مہینے کے لیے مجھے بھی بلایا جب میں آیا تو معلوم ہوا ڈاکٹر شرافت حسین مرزا صاحب چھٹی پہ نہیں جا رہے ہیں مجھے بے یار و مددگار یہاں رہنا پڑا میں نے فاروقی صاحب سے کہا کہ میں گھر جا رہا ہوں عید کا تہوار بھی آ گیا ہے انھوں نے کہا نہیں آپ گھر نہیں جائیں گے چنانچہ میری پہلی عید بے سروسامانی میں دہلی میں ہوئی انھوں نے کہا آپ گھر نہیں جائیں گے یہیں رہیں گے انہوں نے مجھے ڈاکٹر تارہ چند سے ملوایا جو ایران میں ہندوستان کے سفیر رہے ان کے پاس ایک پروگرام تھا اردو کا نصاب تیار کرنے کا انہوں نے کہا آپ ڈھائی مہینہ یہ کام کیجئے اس کے بعد پھر فاروقی صاحب نے ع

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مجھے یو جی سی سے پانچ سو روپے کا پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلوشپ دلوایا علامہ شبلی پہ کام کرنے کا اس طرح سے دہلی میں رہنا پڑا اس کے بعد 1967ء میں شعبۂ اردو کا جو ایوننگ کالج تھا عارضی لکچرر پر تقرر ہوا اس لیے کہ قمر صاحب تاشقند گئے ہوئے تھے، جب

قمر صاحب آ گئے تو مستقل جگہ مشتہر ہوئی کیوں کہ قمر صاحب ریڈر ہو کر ڈپارنمنٹ آف اردو میں آ گئے تھے اس زمانے میں ایوننگ اور مارننگ کی دو صورتیں ہوا کرتی تھیں ۔اساتذہ ڈپارنمنٹ کے ہوتے تھے لیکن اسٹاف ان کا ایوننگ میں ہوا کرتا تھا مگر جو پڑھنے والے ہوتے تھے وہ مجھ سے دوگنی عمر کے تھے۔ چنانچہ میرے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا اس دن مجھے بڑی شرمساری ہوئی جب میں پہلے دن کلاس میں لے جایا گیا پروفیسر فاروقی نے میرا تعارف کرایا اتفاق ہے اس زمانے میں شریف صاحب اور فریدی صاحب موجود تھے فاروقی صاحب نے میرا تعارف کرایا اس کے بعد اب میں کلاس روم میں دیکھتا ہوں تو وہاں میرے والد بزرگوار کے برابر عمر والے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں ہوتا یہ تھا کہ ایوننگ میں جو داخلہ ہوتا تھا وہ ملازمت پیشہ تھے۔ ملازمت پیشہ لوگ وہی ہوتے تھے جو عمر رسیدہ تھے ، میں نے دیکھا کہ یہاں زبیر رضوی موجود ہیں ان سے کوئی تعارف نہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ مجھ سے بہت بڑے اور بڑے لمبے چوڑے بھی اور یہاں یہ بھی عرض کروں کہ چونکہ گاؤں سے آیا تھا تو مزاج میں سادگی تھی اور لباس میں بھی سادگی اور رہن سہن میں بھی کوئی ایسا رکھ رکھاؤ نہیں تھا حسبِ معمول میں پینٹ اور شرٹ میں کلاس لینے گیا تو وہاں دیکھا تو باقاعدہ لوگ بہت منظّم اور یوں سمجھیے کہ مربوط ہو کر کے آئے ہیں اور ان کے لباس اور ان کی چال ڈھال کا مجھے احساس بھی ہوا۔ زبیر رضوی نے کلاس میں ایک سوال بھی کیا کہ سر یہ نظیر کی تاریخ پیدائش نہیں ہے اور آدمی نامہ ہی پڑھانے کو ملا تو خیر میں نے کہا مجھے یاد ہے نظیر کی ولادت یہ ہے میں نے کہا کہ آپ کہتے ہیں میں بھی دیکھوں گا بہت شکریہ دوسرے دن پھر آئے تو کہنے لگے کہ نہیں سر جو آپ کہہ رہے تھے وہی تاریخ ولادت ان کی ہے مجھ سے تھوڑی سی غلط بات ہوگئی۔ خیر تو اس طرح سے ان بزرگوں کو پڑھانے کے لیے ڈاکٹر معید رشیدی مجھے بڑی محنت کرنی پڑی میں دوسرے دن ڈاکٹر محمد حسن صاحب کے پاس گیا ایک اسٹاف روم ہوا کرتا تھا اسی میں سب لوگ بیٹھتے تھے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی بھی ہیں قمر صاحب بھی ہیں غوری صاحب بھی ہیں فریدی صاحب بھی ہیں سبھی لوگ خواجہ صاحب کا کمرہ الگ ہوا کرتا تھا، محمد حسن صاحب نے پوچھا کیا گزری کیسی گزری تو میں نے کہا

صاحب بہت ناگوار کزری.... یہ تو میرے بس کا نہیں ہے۔ظاہر ہے کہ یہ جو کلاس میں طلبہ ہیں ان کا مطالعہ بھی تو گہرا ہے۔ میں تو اقبال ہی کو لے دے کے آیا تھا مطالعہ تو وسیع تھا ہی نہیں صرف اقبال تک محدود تھا اور اقبال کہاں تک ساتھ دیتے۔

سوال:۔ تھوڑی دیر پہلے آپ نے خواجہ احمد فاروقی کے حوالے سے ڈاکٹر تارا چند کا ذکر کیا تھا ظاہر ہے ان کا نام دنیا بھر میں بحیثیت مورخ جانا جاتا ہے ان کی مشہور کتاب 'ہندوستانی تہذیب پر اسلام کے اثرات' ہے آپ کی کتاب پڑھتے ہوئے مجھے ریفرنس ملا ڈاکٹر تارا چند کا کہ ان سے ملاقات ہوئی آپ کی اور وہ اقبال کے بڑے عاشق تھے تو یہ کیا کیسے انکشاف ہوا!؟

جواب:۔ ڈاکٹر صاحب یہ اس دور کے جتنے دانشور یا جتنے ذی علم تھے بیش از بیش وہ اردو زبان وادب اور اردو تہذیب سے واقف تھے اور واقف ہی نہیں بلکہ ان کا خاص لگاؤ تھا اس کی مثال میں آپ فراقؔ کو دیکھ لیں خواجہ احمد فاروقی صاحب کے علمی شوق وذوق کو دیکھیے ۔ایم۔اے کے وائیوا کے لیے احتشام صاحب نے فاروقی صاحب کو بلایا وہ گئے فاروقی صاحب کو پہلی بار الہ آباد بلایا گیا تھا ہمارے زمانے میں اردو کے پروفیسروں میں آج جو فاصلہ ہے اس زمانے میں بھی فاصلہ ہوا کرتا لیکن وہ دبی زبان سے ہوتا تھا آج تو ذرا برملا ہے ۔احتشام صاحب سے فاروقی صاحب کے یا سرور صاحب سے بھی زیادہ مراسم نہیں تھے اس کے برخلاف پروفیسر ہاشمی سے دوستی تھی۔ دونوں کی دلداری بڑی مشہور تھی اور فاروقی صاحب کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے ملک کے مختلف علاقوں سے اساتذہ کا انتخاب کرلیا تھا زبان وادب ہی نہیں بلکہ ان کی ذاتی زندگی میں بھی تعلق تھا مثلاً پٹنہ سے اختر اورینوی اردو میں ایسا لمبا چوڑا اور قد وقامت کا کوئی پروفیسر نہیں دیکھا جو پروفیسر اختر اورینوی کی تھی ان سے ان کی یاری تھی دہلی یونیورسٹی کی مختلف محفلوں میں مختلف بہانے سے انہیں یاد کیا جاتا تھا لکھنؤ یونیورسٹی سے پروفیسر ہاشمی کو اور ہاشمی صاحب کو پروفیسر بنانے میں فاروقی صاحب کا بڑا رول ہے یہ بات بھی آپ سے کہہ دوں کہ پروفیسر ہاشمی صاحب کو پروفیسر ہوتا تھا ان کے انتخاب میں فاروقی صاحب بحیثیت ایکسپرٹ کے گئے

تھے ۔غالباً حیدرآباد سے محترمہ رفیعہ سلطانہ کو آنا تھا ایکسپرٹ ہوکر وہ نہیں آسکیں وائس چانسلر نے سلیکشن کمیٹی میٹنگ ملتوی کرنی چاہی فاروقی صاحب کی حکمت عملی دیکھیے اوران کی علمی قدوقامت کا اندازہ لگایئے انھوں نے وائس چانسلر سے کہا کہ نہیں میں آ گیا ہوں تو کافی ہے اور آپ کے شہر میں ایسے اردو کے جاننے والے لوگ ہیں کہ ان کو آپ کمیٹی میں رکھ سکتے ہیں وائس چانسلر شش وپنج میں تھے فاروقی صاحب نے کہا کہ بیگ صاحب الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ میں جج ہیں وہ اردو کے کارشناس ہیں آپ ان کو بلایئے ظاہر ہے کسی وائس چانسلر کی مجال نہیں ہوسکتی آپ جانتے ہیں کہ صوبے کی جتنی یونیورسٹیاں ہوتی ہیں ان سب کا سرپرست گورنر ہوتا ہے ہائی کورٹ کے ایک جج کا نام لیا جانا وائس چانسلر کے لیے بڑا آزمائشی تھا چنانچہ انھوں نے یہ بات مان لی کہ فاروقی صاحب نے کہا کہ آپ ان کو فون کریں ان کو آمادہ کریں یہاں سلیکشن کمیٹی ہے آپ کو آنا ہے بیگ صاحب آئے ہاشمی صاحب کا انتخاب ہوگیا فاروقی صاحب کی حکمت عملی تھی کہ اردو کی آسامی خالی نہ رہنے پائے جو بدقسمتی سے آج ہماری نظروں سے اوجھل ہے یا ہماری بصیرتوں میں نہیں ہے لکھنؤ سے ہاشمی صاحب حیدرآباد سے پروفیسر رفیعہ سلطانہ ممبئی سے اشرف ندوی صاحب حالانکہ وہ اسماعیل ڈگری کالج کے استاد تھے ندوی صاحب معاف کیجئے گا ان کا پورا نام بھول رہا ہوں وہ آتے تھے یہ مختلف علاقوں سے انھوں نے ایسے لوگوں کو منتخب کررکھا تھا انھیں کو مدعو کرتے تھے۔

سوال:۔ ذکر تھا تارہ چند کا؟

جواب:۔ جی فاروقی صاحب ان تمام ذی علم اساتذہ سے یا اسکالر یا دانشوروں سے ربط رکھتے تھے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے ایسے لوگوں کی قدر کرتے تھے چنانچہ دوسرا نظام خطبہ ڈاکٹر تاراچند نے دیا۔ میں عرض کررہا تھا فاروقی صاحب الہ آباد گئے وائیوا سے فارغ ہوگئے تو مجھ سے کہنے لگے آیئے پروفیسر دیو کے یہاں چلتے ہیں اور پروفیسر دیو انگریزی کے بڑے ذی علم پروفیسر تھے ہندوستان میں ان کا بڑا شہرہ تھا ان کی انگریزی زباں دانی کا اور انگریزی صلاحیتوں کا یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ پروفیسر فاروقی کو پروفیسر دیو سے کیا تعلق لیکن

وہ ان کے یہاں لے گئے اور بہت دیر تک رہے مجھے آج بھی یاد ہے پروفیسر دیوفرش پر بیٹھے ہوئے فرش پر دریاں بچھی ہوئی تھی وہ گلے میں ایک مالا اور بنیان پہنے ہوئے کچھ کتابیں سامنے رکھی ہوئیں تھیں ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں اسی طرح سے پروفیسر فاروقی کا تعلق ڈاکٹر تاراچند سے بھی تھا ہمیں آپ کو یہ معلوم ہے کہ ڈاکٹر تاراچند تہران میں ہمارے سفیر بھی رہ چکے ہیں وہ مغلیہ دور کی تاریخ کے ماہر تھے وہ فارسی بھی جانتے تھے تغلق روڈ پران کا قیام تھا فاروقی صاحب سے ان کے بڑے مراسم تھے آپ کو یہ بھی بتادیں کہ ڈاکٹر تاراچند پنڈت نہرو کی نظر میں اور ان سے زیادہ مولانا آزاد کی نظر میں محبوب تھے۔اس سلسلے سے بھی فاروقی صاحب ان کے قدردان تھے۔

سوال:۔ آپ کی دوملاقاتیں ہوئیں خواجہ صاحب نے آپ کو بھیجا وہ اقبال کے بڑے عاشق تھے؟

جواب:۔ جی میری پہلی ملاقات تھی اول میں دہلی سے ناآشنا تغلق روڈ بسوں کے دھکے کھاتے ہوئے میں وہاں پہنچا اس زمانے میں عمر ایسی تھی کہ ہر محنت اور مزدوری گوارا تھی بہرحال میں بسوں پہ چڑھتے اترتے ان کے گھر پہنچا ان کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور بہت بے تکلفی کے انداز میں جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کس پر کام کیا ہے (پی۔ایچ ڈی) کا میں نے بتایا اقبال پر تو انہوں نے فوراً اچھا.....''میر عرب کوئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے'' میں نے کہا جی لیکن اس وقت جوان تھا اور اپنی علم دانی کا اور اقبال شناسی کا زعم بھی تھا میں نے کہا ڈاکٹر صاحب یہ روایت غلط ہے انھوں نے کہا کہ یہ حدیث ہے میں نے کہا یہ حدیث نہیں ہے ضعیف حدیث ہے لیکن بہرحال اس کے بعد اقبال پر گفتگو کرنے لگے تو میں بڑی نیاز مندی کے ساتھ جواب دیتا رہا یہی وہ زمانہ ہے کہ تہران میں بھی اقبال شناسی کا آغاز ہوا تھا ہندوستان کا سفیر کبیر اگر اقبال پر گفتگو کرے اور ابھی اقبال لاہوری والی کتاب نہیں آئی تھی نفسیسی کی تو ہم آپ واقف ہیں کہ ہمارا جو سفارتی مشن ہوتا ہے اپنے ملک کی نمائندگی کے ساتھ وہاں کے باشندوں کی تہذیب وثقافت کو بھی زیر نظر رکھتا ہے چونکہ انھوں نے دور

متوسط کی تاریخ پر کام کیا تھا اس دور کی تاریخ پر کوئی کتاب مکمل نہیں ہوسکتی اور کوئی استاد مکمل نہیں ہوسکتا جب تک وہ فارسی نہ جانتا ہو اس لیے کہ ساری کتابیں فارسی میں ہیں ایک یہ بڑا پہلو تھا جو فاروقی صاحب کی قدر دانی کا سبب بنا۔ انھوں نے جب مخطوطہ شناسی کا کورس شروع کیا۔ شبیر احمد خان غوری جو الہ آباد بورڈ سے ابھی ریٹائر ہوئے تھے ان کو بہ منت سماجت بلایا وہ علی گڑھ کے باشندے تھے۔ یہاں بلایا پروفیسر ضیاء احمد بدایونی جو فارسی کے پروفیسر تھے علی گڑھ میں ریٹائرمنٹ کے بعد ان کو یہاں بلایا رشید حسن خاں کو شاہ جہاں پور سے بلایا ڈاکٹر حسن صاحب کو علی گڑھ سے لے آئے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ ڈاکٹر محمد حسن صاحب اور فاروقی صاحب کے نظریات میں زمیں آسماں کا فرق تھا مگر ان کی علمیت اور ان کی اسکالرشپ کی وجہ سے لائے نظریے کی مخالفت کے باوجود بھی شعبہ میں جگہ دی یہ فاروقی صاحب کا مزاج تھا!

سوال:۔ اختلافات اپنی جگہ لیکن علم کا اعتراف اور علم کی قدر اپنی جگہ تو یہ بڑے لوگوں کا کام ہوا کرتا ہے ایک روایت اور تھی خواجہ صاحب نے اس کی بنا ڈالی تھی شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں باہر سے اگر کوئی مہمان آتا کوئی اہم شخصیت آتی کوئی شاعر آتا تو شعبے میں مدعو کرتے اور اور اس کے اعزاز میں جلسہ ہوا کرتا تھا آپ کی کتاب میں یہ واقعہ میں نے پڑھا آپ اس پر بہتر روشنی ڈالیں گے کہ جوشؔ پاکستان بننے کے بعد وہاں منتقل ہوگئے اور پھر جب پہلی بار وہاں سے آئے تو خواجہ صاحب نے انہیں شعبے میں مدعو کیا اور ان کے اعزاز میں جلسہ بھی کیا اور آپ اس جلسے میں موجود تھے اس محفل کا حصہ تھے تو میں چاہتا ہوں کیا رونق تھی جوشؔ ملیح آبادی پڑھتے کیسے تھے ذرا اس پر آپ روشنی ڈالیے کہ پڑھنے کا انداز کیا تھا؟

جواب:۔ کہنا تو نہیں چاہیے لیکن آپ عزیز ہیں تو یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ ہمیں کیا دیکھتے ہو ہم نے ایک عالم کو دیکھا ہے جوشؔ صاحب کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن جب ان کی آمد کی خبر ہوئی فاروقی صاحب کی یہ خوش مزاجی کہیے ابھی آپ نے ذکر کیا بلکہ اعتراف کیا کہ علم دوستی ان کا ہدف ہوا کرتا تھا شہر میں کوئی بھی علم دوست آئے فاروقی صاحب اسے

مدعو کرتے اور مدعو کرنے کے بہانے ڈھونڈتے شعبہ میں بلاتے مثلاً وہ بھی ایک پوری داستان ہے اختر الایمان جب بھی دہلی آتے تو کئی دن فاروقی صاحب کے یہاں ٹھہرتے اور جاں نثار اختر تو ہر حال میں ان کے گھر ٹھہرتے ہی تھے انھیں شعبے میں بلاتے اگر چہ فاروقی صاحب شعر خوانی کے بالکل مخالف تھے یہ عجیب بات ہے شعر خوانی سے مشاعروں سے وہ گھبراتے ہی نہیں تھے بلکہ اس سے ایک گونہ کدورت رکھتے تھے ہمارے شعبے میں جو شاعر تھے مثلاً فریدی صاحب کو اس سلسلے سے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ظہیر صاحب بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے ان کو بھی ٹوکتے تھے جوشؔ صاحب آئے تو انھوں نے محمد حسن صاحب کو مامور کیا آپ جائیں اور جوش صاحب کو آمادہ کریں وہ شعبے میں تشریف لائیں ڈاکٹر صاحب میں عرض کروں کہ دہلی یونیورسٹی کا جو وقار تھا یہاں ہر شخص آنے کے لیے خواہش مند ہی نہیں بلکہ ترستا تھا میں نے یہ ترسنا کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا کہ بڑے بڑوں کو میں دیکھا ہے سردار جعفری نے کئی بار کوشش کہ شعبۂ اردو میں آئیں فاروقی صاحب نے کبھی ان کو ترجیح نہیں دی اور بہت سے پروفیسر حضرات کی بڑی خواہش تھی یہ بات کہنے میں حرج نہیں ہے کہ پروفیسر گیان چند جین نے تو سرکاری طور پر وائس چانسلر سے درخواست کی دہلی یونیورسٹی میں بلائے جائیں۔ انہوں نے ان کی وائس چانسلر کے کہنے سے ایک کمیٹی میں رکھا اس زمانے کی اپنی دوریاں اور فاصلے تھے لیکن جو اہل ہنر تھے ان کو بلانے میں فاروقی صاحب پیش پیش ہوتے تھے محمد حسن صاحب جوش ملیح آبادی کی شاعری پر مضمون لکھ چکے تھے تین دن پہلے ہم لوگوں کو ہدایت تھی کہ پورا اسٹاف جوش صاحب کی آمد پر موجود رہے فریدی صاحب کو مامور کیا کہ آپ جوشؔ صاحب کی آمد پر قطعہ تاریخ لکھیں چنانچہ محمد حسن صاحب جوشؔ صاحب کو گاڑی میں لے کے آئے وہ نئی دہلی میں کہیں ٹھہرے ہوئے تھے جس کا علم نہیں وہاں سے ان کے ساتھ ہم رکاب ہوئے تھے فاروقی صاحب نے ایک تعارف کرایا اس کے بعد محمد حسن صاحب سے ان کی ادبی اور تخلیقی خدمات پر مفصل گفتگو کے لیے کہا گیا انہوں نے گفتگو کی جوشؔ صاحب نے کئی نظمیں سنائیں۔ بچوں کی فرمائش پر انھوں نے جامن والیاں اور اس کے بعد کسان والی نظم کا

ایک بند سنایا باقی تو یاد نہیں تھا جلسہ ختم ہوا تو قطعہ تاریخ کے لیے فریدی صاحب کو مدعو کیا گیا۔

یہ کون آیا کہ بزم شعر ونغمہ جگمگا اٹھی
صدائے قلقلِ مینا میں کس کا نام سے ساقی
چمن سے یہ کہتی ہوئی بادِ صبا نکلی
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ وخیام ہے ساقی

جوشؔ صاحب سے فرمائش کی گئی انہوں نے کئی نظمیں سنائیں وہ سفید شیروانی پہنے ہوئے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے شیروانی کے بٹن آدھے کھلے ہوئے اور آدھے بند تھے پان کی ڈبیا جیب میں تھی اسے جیب سے نکال کر میز پر رکھا پان کا بیڑا ابھی انہوں نے لیا باقی چائے پینے کے لیے فاروقی صاحب نے ان کو اپنے کمرے میں مدعو کیا وہاں ہم لوگوں کی گزرگاہ نہیں تھی بلکہ مجھے فضل الحق صاحب اور قدوائی صاحب کو لڑکوں کی ضیافت کے لیے کہا گیا تھا خیر ابھی آپ نے ذکر کیا جاں نثار اختر کا اختر الایمان اور فاروقی صاحب کبھی ساتھ رہے تھے۔ دہلی میں جب زندگی کا ایک خاص دور تھا تو فاروقی صاحب بھی اسی دور سے گزر رہے تھے۔ یہیں دہلی کالج کے ہاسٹل ہی کے کسی کمرے میں دونوں کی رہائش بھی تھی۔

سوال:۔ اب ایک پہلو کی طرف میں آپ کا ذہن مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اقبال ظاہر ہے ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں جس طرح اقبال نے لفظوں کو برتا ہے نایاب اور بلکہ کہوں کہ اردو شاعری میں پہلی بار لفظیات کا ایسا معجزہ کہ لیجیے کہیں نہیں دیکھا گیا تھا ایسی تراکیب بالکل نئی جسے ہم کہتے ہیں کیا نیا ہے اردو غزل میں اردو نظم میں نیا کیا نیا ہی نیا ہے غزل نے تو ایسی کروٹ لی ہے اقبال کے یہاں آکر تصور نہیں کیا جاسکتا تھا یہ تو کمال ہے وہیں ہم جوش کو بھی دیکھتے ہیں کہ اہم شاعر ہیں انہیں ہم لفظیات کے حوالے سے زبان کے حوالے سے ہی یاد کرتے ہیں۔

جواب:۔ بہت سہی

سوال:۔ ان کا ملکہ ہے کہ لفظ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں جوش ڈکشن کے نہیں دکشنری کے شاعر ہیں کسی نے کہا تھا ان دونوں شاعروں کی موجودگی میں بحیثیت طالب علم یہ جاننا چاہتا ہوں کہ زبان کا دونوں کے یہاں برتاؤ کیسا ہے؟ آپ کیسے دیکھتے ہیں!؟

جواب:۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے جو بات کہی ہے وہ فکر انگیز ہے اور غور طلب بھی اس پر محاکمہ کی ضرورت ہے بزرگوں سے یہ بحث چلی آرہی ہے کیا زبان دانی اچھی شاعری کی دلیل ہے یا اس سے ماسوا اور ماورا بھی کوئی چیز ہے ابھی آپ نے بہت اچھا جملہ دہرایا ہے کہ ڈکشن الگ چیز ہے اور ڈکشنری ایک دوسری شے ہے بقول اقبال کے لغت کے پھندوں میں جو گرفتار ہے وہ اچھی شاعری کی دلیل نہیں ہوا کرتی اگر یہ ہوتا تو بہت شعرا صرف لغت کی بنیاد پر اچھے شاعر ہوتے لیکن ان الفاظ کے پردوں میں اگر فکر پنہاں نہ ہو فکر کی ارجمندی اور بلندی سے شاعری بلند ہوتی ہے اگر فکر ہی ناتمام ہے ادھوری ہے یا اس میں بلوغت یا بلاغت نہیں ہے تو شاعری لفظوں کے سہارے نہیں چل سکتی اقبال نے تو بار بار اقرار کیا ہے کہ فکر کے شایانِ شان الفاظ بھی ہوں تب دونوں میں ایک مشابہت ہوتی ہے اور دونوں میں امتزاج قائم ہوتا ہے وہ ارتباط لفظ و معنی پر زور دیتے ہیں اس کی مثال غالبؔ اور اقبال دونوں کی شاعری ہے غالب کی شاعری اس لیے بلند ہے کہ اس میں افکار کی بلندی ہے خیال میں تموج ہے یہ لفظ جو آپ نے استعمال کیا اگر اس میں ارتفاعیت ہے تو شاعری بھی بلند ہوگی ورنہ ''رب کا شکر ادا کر بھائی'' کا حال ہوگا جوشؔ نے عام موضوعات کو لیا ہے منظر نگاری ان کی بڑی کامیاب ہے لیکن جب کھیت کھلیان کا ذکر کرتے ہیں اور اس میں وہ الفاظ لاتے ہیں تو لگتا ہے یہ کھیت کھلیان کا منظر نہیں ہے مثلاً کسان نظم ہے نصاب میں شامل ہے بارہا ہم نے آپ نے پڑھی ہے کسان ہل چلاتا ہے تو مٹی الٹتی پلٹتی ہے لیکن اب اس منظر کو ظاہر ہے جوش ہی کہہ سکتے تھے لیکن اس میں کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔

جس کے ہل جانے سے مثلِ نازنینِ مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

یہ مثال بڑی خوبصورت ہے کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں آپ تو استعارے کے رسیا اور رمز شناس ہیں استعارہ جو اصل منظر سے دور ہو جائے تو پھر نہ استعارہ رہتا ہے نہ منظر کشی ہوتی ہے۔ اقبال کے یہاں کمال ہے کہ مشکل سے مشکل الفاظ ہیں ان میں بلا کی منظر کشی ہے۔ مسجد قرطبہ میں ہے

سادہ و پر سوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت

یا

شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ تخیل

اس کو بھی چھوڑیے بالِ جبریل کی غزل کا جس کا ابھی آپ نے ذکر کیا کہ غزل کی پوری ہیئت کو بدلنے والا اقبال ہے اردو فاسی فارسی غزل گوئی کی تاریخ میں آپ دیکھیں منظر کشی کا یہ لطف کہیں نظر نہیں آتا بلکہ یہ تو غزل کے معیار اور دستور کے خلاف ہے۔

پھر چراغ لالہ سے ہوئے روشن کوہ ودمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

اس پوری غزل کو آپ دیکھیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور آپ فارم کو توڑنے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ بالِ جبریل کو لے لیں کہ انہوں نے تخلص کا اہتمام نہیں کیا انہوں نے ردیف و قافیے کی بھی پرواہ نہیں کی۔ آپ ہیئت بھی دیکھ لیں بال جبریل کی پہلی غزل پر ایک عنوان لگا دیجیے ع

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں

اس پانچ شعر کی غزل کے اوپر عنوان رکھ دیں 'نوائے شوق' تو ایک نظم ہو جائے اور ع

سادہ و پر سوز ہے دختر دہقاں کا گیت
کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب

یہ بند مسجد قرطبہ سے لے لیجیے تو غزل ہو جائے گی حیرت کی بات ہے اور ہمیں آپ کو یہ اچھی طرح معلوم ہے جس پر اقبال کی فکر اور ان کے ایمان و عقیدے کا انحصار ہے

آج تک یہ بحث جاری ہے کہ ''ذوق وشوق'' کا بند حمد ہے یا نعت

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

آپ صحیح فرمارہے ہیں کہ پوری پوری ہیئت بدل دی ہے نظموں کی ہیئت بدل گئی اب جس طرح ع

بندۂ تخمین وظن کرم کتابی نہ بن !

کہیں مخمس ہے تو مسدس بھی ہے۔

سوال:۔ ہندی چھند میں بھی اقبال نے کیا کمال کیا ہے؟

جواب:۔ پوری پوری غزل ع

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں !

معاف کیجئے گا آپ نے اچھا ذکر کیا دوسری غزل کا ایک شعر ہے جس پر فراق گورکھپوری نے کہا ہے جب کہ فراقؔ اقبالؔ کے بہت معترف نہیں ہیں کہ ایشیا بھر کے شاعر مل کر کے بھی اگر اس غزل کا جواب چاہیں تو نہیں کہہ سکے:

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

آپ نے صحیح کہا ہندی چھندوں کو اقبال نے اس طرح استعمال کیا کہ اس میں بڑا لطف پیدا ہو گیا ہے اقبال کا ایک مصرعہ کسی بھی وزن کسی بحر سے خارج نہیں ہے۔ یہ حیرت ہے کہ ہزاروں ہزار شعر کہنے والا وزن اور قافیے کا اتنا پابند ہے اقبالؔ نے صرف تجربہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کی خوبصورت مثالیں بھی تخلیق کر کے تخلیق کی دنیا میں ایک مثال قائم کی ہے آپ نے جس غزل کا حوالہ دیا ہے آپ بال جبریل کی دوسری غزل کو دیکھیے جہاں لمبی اور طویل بحر کی غزل ہے تو اختصار بھی قابلِ غور ہے۔

ہر شے مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

تو مردِ میداں تو میرِ لشکر
نوری حضوری تیرے سپاہی

چھوٹی بحر کی غزل میں عجیب آہنگ ہے، آہنگ میں روانی ہے آگے بڑھنے کی طرف رواں ہے یہ عجیب شے ہے کہ اشعار کا آہنگ متحرک ہو دیکھیے یہ شاعرانہ کمال

گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

سوال:۔ اچھا اقبال کو موسیقی سے خاص ربط تھا اور ان کی شاعری میں جو نغمگی ہے وہ بحروں میں آہنگ میں صاف محسوس ہوتی ہے!

جواب:۔ ڈاکٹر صاحب یہ آپ نے اچھے نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے میں آپ سے عرض کروں اپنے جزوقتی استاد مجنوں گورکھپوری کا ذکر کر رہا ہوں مجنوں گورکھپوری نے اپنی کتاب جس کا ابھی میں نے ذکر کیا اقبال میں لکھا ہے کہ ''اقبال کا کوئی ایسا شعر نہیں جو ساز کے کسی نازک سے نازک تار پر گایا نہ جا سکے'' یہ مجنوں گورکھپوری کے الفاظ ہیں بلا کی موسیقی اور آہنگ کی مختلف النوع کیفیات ہیں مسجد قرطبہ کا آہنگ آپ دیکھیے ع

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

ذوق و شوق کو دیکھیے ساقی نامہ کا آہنگ دیکھیے بالکل مختلف ہے

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن شہیدِ ازل لالہ خونی کفن

اس کا آہنگ بالکل مختلف ہے اس کے بعد نظم ہے ''لینن خدا کے حضور میں''

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات

اس آہنگ کی خوبی یہ ہے کہ اقبال نے ان لفظوں کی طرف جس کا ابھی آپ ذکر کر رہے تھے غیر مانوس اور لغات کے الفاظ لا کو شعر میں پیوست کیا ہے اردو کے ذخیرہ میں بہت سے الفاظ شامل ہوئے اور نغمگی کے ساتھ یہی نہیں ان کے معنی و مفاہیم بھی اقبال نے بدل دیئے۔ ''خودی'' کا لفظ بہت پامال ہے خودی کے معنی لغت میں کچھ اور ہیں

شاعری میں کچھ اور تصوف میں اور لیکن اقبالؔ نے اس میں ایک جہانِ معنی کو اس طرح پیش کیا کہ خودی کا مفہوم بالکل بدل گیا یہی صورت بے خودی عقل وعشق زماں ومکاں ودوسرے بہت سے الفاظ کی ہے جن میں اقبال نے نئے معنی کو پیوست کر کے بڑی خلاقی کا کام کیا ہے یہ بڑے لوگوں کا کام ہے رشید صاحب نے لکھا ہے کہ اقبال کی شعری قامت پر زبان کا لباس کستا ہوا نظر آتا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ اقبال کو اپنے ابلاغ کے لیے نئی زبان بھی گڑھنی پڑی جب کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے آپ بیسویں صدی کے منظر نامے پر اسے دیکھیں دنیا کے کسی ادب میں ایسی قد وقامت کا ایسا کوئی شاعر اور ادیب نظر نہیں آتا میں آپ سے چھوٹی بات کہتا ہوں کہ آج تک سو سال سے زیادہ گزر گئے اقبالؔ کے ایک ترانے کی کیفیت کسی دوسرے ترانے میں پیدا نہیں ہوسکی اردو ہی نہیں میں تو بانگِ دہل کہتا ہوں کہ ہندوستان کی ساری زبانوں کا ادب ایک صدی گزر جانے کے باوجود بھی ترانے کا کوئی بدل پیدا نہ کرسکا ''بچے کی دعا'' معمولی سی نظم ہے ترجمہ ہے لیکن ترجمے میں کیا شان پیدا کی ہے یہ بڑے خلاق کا ہی کمال ہے ظاہر ہے کہ اس پر ہمیں ناز ہے یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ صدیاں گزر جائیں گی لیکن اقبال کی شاعری اور ان کی شعری لطافت اور معنی آفرینی کم نہیں ہوگی!

سوال:۔اس پر باتیں ہوتی رہیں گی لوگ نئے نئے نکتے دریافت کرتے رہیں گے اقبال کے ایک پہلو پر گفتگو ہمارے یہاں ذرا کم ہوتی ہے ان کی دلچسپی کا ایک موضوع اقتصادیات بھی ہے اور یہاں تو 1936ء میں ان مسائل نے زور پکڑا جبکہ 1904ء میں اقبال نے اقتصادیات پر پہلی کتاب تحریر کی اقبالؔ کی اس کتاب پر آپ کے کیا خیالات ہیں اور کیا رائے ہے ؟

جواب:۔ڈاکٹر صاحب آپ کی اقبال شناسی کو داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ یہ اقبال کا بہت اہم پہلو ہے جسے نظر انداز کیا گیا ہے اور آپ نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے یہ اقبال ہی کی کتاب نہیں بلکہ اردو میں ان موضوعات پر پہلی کتاب ہے بظاہر تو اس کا نام ''علم الاقتصاد'' ہے لیکن اس میں جو مضامین ہیں بڑے عجیب وغریب ہیں ان مضامین کا اگر تجزیہ کیا جائے

تو اقبالؔ کی عبقری وعلمی بصیرت، جوفکر سے وجدان تک پہنچتی ہے اس کی انتہاؤں کا پتا چلتا ہے آپ دیکھیے کہ 1904ء میں معاش ومعیشت کا مسئلہ ہی نہیں تھا 1917ء میں انقلاب روس کے بعد یہاں مزدوراور سرمایہ دار کی کشاکش کا آغاز ہوتا ہے 1904ء میں معاشیات ومزدوری سرمایہ داری، لگان، آبادی، محصول، نظام کاشت پر گفتگو کے مباحث اس کتاب میں موجود ہیں اور حد یہ ہے کہ محترمہ اندرا گاندھی کے وزارت عظمیٰ اور ایمرجنسی کے زمانے میں فیملی پلاننگ کی حمایت میں اس کتاب کی عبارت کو شائع کر کے تقسیم کیا گیا تھا.....اچھا ؟ جی ہاں خاص طور سے تقسیم کیا گیا اس لیے کے بعض حلقوں میں اس کی مخالفت ہورہی تھی۔ اقبال کے حوالے سے مشتہر کی گئی مزے کی بات ہے کہ اقبال کو کیسے سوجھی کہاں سے سوجھی لیکن جوسوجھی بقول انشاؔء کے خوب سوجھی انہوں نے لکھا ہے کہ ہائر ایجوکیشن کو فروغ دیا جائے اس لیے کہ نوجوان طلبہ اگر ایم۔اے اور اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کی طرف مائل ہوں گے تو اس مدت میں شادیاں نہیں ہوں گی۔ تو شرح پیدائش بھی کم ہوگی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کو فروغ دیا جائے اور یہی نہیں انہوں نے جبری تعلیم کی وکالت کی ہے آج جس جبری تعلیم کی ہم اکیسویں صدی میں دو چار سال سے بات کررہے ہیں، جبری تعلیم کی اقبال نے وکالت بہت پہلے کی ہے ان کے خیال میں معاشرہ تعلیم یافتہ نہیں ہوگا ہم شرح نمو کو اور شرح پیدائش کو کنٹرول نہیں کر سکتے معاشرہ تعلیم یافتہ ہوگا تو ہماری کاشت اور ہماری روزی کو فروغ ملے گا ہماری معیشت پہ بھی اثر پڑے گا۔ انھوں نے ایک بڑی بات کہہ دی جس کا آج تک ذکر نہیں ہوسکا ہے انھوں نے کہا:

کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار!

اقبال نے اس کتاب میں گویا 1904ء میں ہی کہہ دیا کہ ملوں میں جو سرمایہ لگا ہوا ہے اس سرمایے کے عوض کارخانہ کا مالک ایک معقول معاوضہ لے لے باقی منافع میں مزدور کا بھی حق ہوتا ہے تنخواہ ہی نہیں یا تھوڑی سی جو سال میں بونس یا اجرت مل جاتی ہے وہ نہیں بلکہ منافع میں بھی مزدور کا حق ہوتا ہے چاہے وہ کاشت کا منافع ہو یا مل کا منافع ہو اور اسی طرح سے تقسیم دولت کا جو مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے اقبال نے بہت کھل کر تقسیم دولت کی

بات کی ہے انھوں نے جبری تعلیم کی مثال دی ہے کہ جب پیغمبر اعظمؐ و آخرؐ نے جبری نماز پڑھنے کی تاکید کی ہے دس سال کا بچہ ہو جائے تو اسے جبراً ترغیب دی جائے ہم اسی اصول پر کاربند رہیں اور جبری تعلیم کے لیے ہم بچے کو ترغیب دیں کوئی بچہ ناخواندہ نہ رہنے پائے آپ اندازہ لگائیں کہ اسے معیشت کا حصہ قرار دیا ہے جب بچہ تعلیم یافتہ ہوگا تو صنعت وحرفت ہو علوم سائنس ہو علوم ارضی ہو سب میں یہ شامل ہوگا اور نئی دنیا آباد کرے گا یہی نہیں کسی بھی شخص کو ہم بھوکا نہ رہنے دیں یہ ہمارا ہدف ہونا چاہئے اور پھر شاعری میں تو آپ نے دیکھا کہ خضر راہ سے لے کر بال جبریل تک وہ باتیں بھی اقبال نے کہہ دیں جو بقول شخصے مارکس اور لینن بھی نہیں کہہ سکے اس کتاب میں اقبالؔ نے مالتھسؔ کا حوالہ دیا ہے مالتھسؔ کا نظریۂ آبادی بہت مشہور ہے اس کتاب کا مطالعہ انھوں نے کیا ہے ابھی داس کیپٹل کا دور دور تک کہیں ذکر نہیں ہے نہ اقبال کے کانوں میں یہ بات آئی ہے نہ ترجمہ ہوا ہے نہ ہندوستان میں کہیں ذکر ملتا ہے داس کیپٹل سے متعارف ہوئے بغیر اقبال نے اپنے طور پر معاش ومعیشت کے بارے میں جن فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے ہمارے سامنے اس کی نظیر نہیں ملتی ایسا بھی نہیں کہ ان کو اکنامکس کے کلاس پڑھانے کو ملے ہوں کہ پڑھانے کی خاطر ان کو یہ مطالعہ کرنا پڑا ہو انہوں نے از خود یہ کتاب لکھی چوں کہ نصاب میں یہ موضوع داخل نہیں ہے اگر چہ بہت ہی اہم ہے نصاب میں پڑھائے جانے کی خاطر ایک کتاب حوالہ کے طور پر انہوں نے یہ کتاب تیار کی اور اس کے بعد آپ دیکھیے کہ ان کی شاعری میں ؎

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد
آبروئے دخترِ مزدور برد!

یہ وہ بات ہے جو مارکس اور لینن بھی نہیں کہہ سکے سرمایہ دار جو بندۂ مزدور کی روٹی ہی نہیں لیتا بلکہ اس کی بیٹی کی آبرو پر بھی نظر رکھتا ہے اور پھر انقلابی شاعری کا وہ شعر ع

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ایسی انقلابی آواز جو معاشی انقلاب کی آواز ہے۔اقبال نے کس ہمدردی سے دیکھا ہے

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں ہے بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

یہ کشمیر سے لے کر پورے ملک کے معاشی بگاڑ ہیں اس پر اقبالؔ کی نظر ہے انہوں نے پنجاب اسمبلی میں اس زمانے میں تقریر کی ہے یہ اقبال کا عجیب فلسفۂ معیشت ہے!

سوال:۔ظاہر ہے اگر اس پہلو سے پڑھنے والا اور تحقیق کرنے والا واقف نہیں ہوگا تو وہ انصاف نہیں کر پائے گا اس لیے کہ بہت بنیادی موضوع ہے اور اقبالؔ کی شاعری میں جہاں اس سے سامنا ہوتا ہے تو بہت ضروری تھا لیکن ہمارے یہاں اس پر ذرا کم باتیں ہوئی ہیں ضرورت ہے کہ اس پر اور باتیں کی جائیں اس پوری گفتگو میں چوں کہ سلسلہ اقبال کا ہے اور ظاہر ہے آپ کے مطالعہ کا محور و مرکز اور آپ کے ممدوح اقبالؔ ہیں جن لوگوں نے اقبالؔ کو اپنا مرکز بنایا ہے وہ بھی خوش قسمت ہیں اس سے اتنے دھارے پھوٹتے ہیں کہ انسان مالا مال ہو جاتا ہے اقبالؔ پر آخری سوال کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ متنازع ہے ہم جانتے ہیں ہمارا ملک 1947 میں تقسیم ہو گیا اور اقبال 1938ء میں رخصت ہو گئے تھے 1938ء تک جو تاریخ ملتی ہے اس میں لفظ پاکستان کا وجود نہیں ہے لیکن پھر بھی اقبال پر یہ.....ان کے بارے میں کہا جاتا ہے میں الزام تو نہیں کہوں گا لیکن ان کے بارے میں ایک طبقہ ایک حلقہ یہ رائے رکھتا ہے کہ وہ بانیِ پاکستان ہیں تو کتنی صداقت ہے اس میں تاریخی طور پر میں یہ جاننا چاہتا ہوں آپ سے؟

جواب:۔ڈاکٹر صاحب یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے اور اقبالؔ ہی نہیں بلکہ پورے اردو والوں پر الزام ہے۔

سوال:۔اس لیے کہ الہ آباد کا خطبہ کچھ اور اشارہ کرتا ہے۔

جواب:۔یہ تہمت طرازی ہے....کچھ لوگ ہوتے ہیں جو ذہنوں کو منحرف کرنے کے لیے شوشے بازی کیا کرتے ہیں یہ علمی اور ادبی سطح پر ہوتا رہا ہے۔سیاست میں بھی اس موضوع

کو اچھالا گیا ابھی آپ نے ایک لفظ استعمال کیا تاریخی طور پر یہ بات بالکل مہمل اور سراسر غلط ہے آپ نے صحیح کہا کہ اقبالؔ نے کبھی اس طرف سوچا بھی نہیں تھا اقبال کی تحریر میں کہیں اس طرح کی کوئی بات نہیں ملتی ابھی آپ نے الہ آباد کے خطبے کا حوالہ دیا اقبالؔ کی پوری شاعری میں کہیں تقسیم ملک کا تقسیم ملت یا قوم کے خلاف ایک مصرعہ نہیں ہے قوموں کے اختلاف کا یعنی یہاں کے جمہور اور اقلیتوں کے درمیان یا ہندو مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا ایک مصرعہ بھی نہیں ملتا آپ کے اس منبر سے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اقبال نے جس کشادہ دلی اور دریا دلی کا مظاہرہ کیا ہندوستان کا ایک ادیب ایک مفکر ایک دانشور نہیں کر سکا۔ انہوں نے علمی اور فکری سطح پر جس طرح مظاہرہ کیا ہے کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ اندازہ لگائیں کہ اقبالؔ کو پیغمبر محمدؐ سے جو محبت ہے وہ کسی سے نہیں ہو سکتی یہ ہمارے ایمان کا جزو ہے لیکن حضرت محمدؐ کے دوش بدوش گوتم بدھ کو بٹھانا عیسیٰ مسیح کو دکھانا یہ کس بات کی دلیل ہے ہندوستان کے کسی ادب میں کسی مفکر نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے معاصر ہیں ڈاکٹر رادھا کرشنن ان کی بھی یہ جرأت نہیں ہو سکی حضرت محمدؐ کے ساتھ ان بزرگ شخصیتوں کو بٹھانا بڑی جرأت کا تقاضا کرتا ہے یہ جرأت مندی کسی اور کے یہاں نہیں ہے اور میں آپ سے عرض کروں 1904ء کی نظم میں تصویر درد ۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہ پہلی انقلابی آواز ہے جو اقبال کی زبان سے ادا ہوئی ۔اس دور کے جتنے اکابرین ہیں جماعتیں بن گئی ہیں پارٹیاں بھی آ گئی ہیں سیاست کے میدان کھل گئے ہیں مفکر بھی ہیں شاعر بھی ادیب بھی ہیں کسی کی زبان سے یہ تنبیہ اور تاکید کے الفاظ نہیں ادا ہوئے اور یہی نہیں اس نظم کے جو شعر ہیں ۔

محبت ہی سی پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے
محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے

ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے

ڈاکٹر صاحب اسی دور 1904ء کی نظم میں شکتی بھی شانتی بھی کہنے والا اقبال ہے یہ کس کی آواز ہے اقبالؔ کی آواز ہے۔

آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

یہ کہنے والا کوئی دوسرا نہیں آپ معاف کیجئے گا ہندوستان کے کسی بھی ادب میں دیکھیں کیا حضرت محمدؐ کے بارے میں وہ الفاظ ہیں جو اقبال نے بھرتری کے بارے میں رقم کی ہیں آپ سے بڑے چیلنج کے انداز میں یہ بات کررہا ہوں کیوں کہ عوام کو گمراہ کرنے کے بہت سے ذرائع ہوتے ہیں اس لیے گمراہی عام کی جارہی ہے لیکن یہ حقیقت ریختہ ڈاٹ کوم کے پلیٹ فارم سے گونجنی چاہئے اور بار بار کہی جانی چاہئے ابھی سنسکرت یونیورسٹی میں پچھلے دنوں عید کے بعد میرا ایک لکچر تھا اردو شاعری میں سنسکرت کے تراجم پر وائس چانسلر پروفیسر آر۔ کے پانڈے صاحب صدارت کررہے تھے میں نے یہی بات کہی کہ بھرتری ہری کو اقبال نے جو مقام دیا ہے ہندوستان کے کسی دوسرے ادب کسی دوسری زبان میں موجود نہیں ہے۔ اقبال نے اپنے سب سے اچھے کلام کا انتساب کیا ہے پھول کی پتی والا شعر آپ کی نظر میں ہے جاوید نامے میں جہاں حضرت عیسیٰ مسیح ہوں گوتم بدھ ہوں حضرت محمد مصطفیٰؐ ہوں وہاں بھرتری کا تذکرہ ہے بھرتری کو جو خراج پیش کیا گیا ہے۔ وہ بے مثل اقرار و اعتراف ہے۔

آں نوا پردازِ ہندی را نگر
شبنم از فیضِ نگاہِ او گہر
کار گاہِ زندگی را محرم است
او جم است و شعر او جام جم است

آسمان اور ستاروں کی بلندیوں پر اس کی فکر ہے یہ کہنے والا کوئی دوسرا نہیں اقبالؔ ہے جاوید نامہ میں اقبال نے اپنے بیٹے جاوید کو نصیحت کی ہے کہ اگر یہ فرق گروگے کہ یہ

مسلمان ہے یہ کافر ہے تو تم سے زیادہ بد بخت کوئی نہیں۔

حرفِ بدرا برلب آوردن خطا ست
کافر ومومن ہمہ خلقِ خدا ست

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

محبت کا عالمی پیغام اقبال سے ہی سنتے ہیں:

محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی
شہید محبت نہ کافر نہ غازی

سوال:۔ ظاہر ہے اقبال کا معاملہ ہی یہ ہے ''ملتیں جب مٹ گئیں اجزا نے ایماں ہو گئیں

جواب:۔ اقبال جیسا محبت کا پیغام دینے والا ہندو مسلم اختلاط کا پیغام دینے والا فکری سطح پر بھی کوئی نہیں، میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا تھا شنکر اچاریہ اور گیتا کا جس احترام سے اقبال نے اپنی فلسفیانہ شاعری کی پہلی کتاب کے مقدمے 1915ء میں ذکر کیا ہے اس کے بعد اقبال نے برہمنوں کو جو خراج پیش کیا ہے وہ بے مثال ہے۔

آں برہمن زادگانِ زندہ دل
لالۂ احمر ز شانِ او خجل

بنارس ہندو یونیورسٹی میں لیکچر تھا وائس چانسلر صدارت کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اقبال نے برہمنوں کے بارے میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں اور ان کے علم و دانش کی تعریف کی ہے ہندوستان میں کہیں نہیں ملتی اور بنارس کی بھی جو تعریف کی ہے ان کو بڑا شوق ہوا انہوں نے یہ کہا کہ یہ نظم مجھے آپ بھجوا دیں میں نے وہ نظم ان کو بھجوائی میں آپ سے یہ عرض کر رہا تھا کہ اقبال جیسا اختلاطی شاعر یعنی ایسا محبت کا پیغام دینے والا تو روئے زمین پر بیسویں صدی میں پیدا نہیں ہوا ہندوستان ہی نہیں پوری روئے زمیں پر آپ ذرا دیکھیں اس کینوس کو دیکھیں براعظم ہی نہیں دنیا میں ایسا شاعر نہیں ہے۔ اس براعظم نے

اقبال جیسا شاعر پیدا کر کے دنیا کے ادب و دانش میں اپنا ایک مقام پیدا کیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اقبالؔ پر دو ہزار سے زیادہ پی۔ایچ ڈی ہو چکے ہیں۔ 2007ء میں اقبال پر سات سو پی۔ایچ ڈی ہو چکے تھے اب تک تقریباً پونے چھ ہزار کتابیں اکتالیس زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے میں آپ سے عرض کروں کہ اقبالؔ صرف اب اردو والوں کا نہیں رہا۔ دہلی یونیورسٹی میں اقبالؔ کے فلسفیانہ تصورات اکنامکس اور اقبال کا تصور سیاست باقاعدہ ایم۔اے کے نصاب میں شامل ہے جیسے جیسے دنیا میں یہ کدورت کی فضا چھٹے گی اقبال کی معنویت اور بڑھے گی!

سوال:۔ عبدالحق صاحب اتنی اچھی گفتگو فرمائی آپ نے اقبال پر ایسے عمدہ گوشے آج روشن ہوئے ہم نے آپ کی زندگی کے احوال بھی جانے اور آپ کی جو علمی خدمات ہیں ان پر بھی گفتگو کی اور ان شخصیات کو آج یاد کیا جو نہ صرف آپ سے وابستہ رہی ہیں بلکہ اس زبان کی روایتوں سے بھی وابستہ رہی ہیں تو ان شخصیات کو بھی آج ہم نے یاد کیا اقبالؔ پر کیا عمدہ گفتگو آپ نے فرمائی چونکہ ہمارا یہ پروگرام ریختہ روبرو سریز ہے اب ظاہر ہے ہر پروگرام ہر گفتگو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی انجام اور کسی نہ کسی اختتام کے نکتے تک پہنچتی ہے آج کی اس گفتگو کے لیے ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں اپنی جانب سے اور ریختہ فاؤنڈیشن کی جانب سے بھی۔

جواب:۔ معاف کیجئے گا یہ تو آپ کی کرم فرمائی ہے کہ آپ نے ان رگوں کے تاروں کو چھیڑا ہے جو مجھے آمادہ کرتی ہیں بلکہ برانگیختہ کرتی ہیں کہ ان پر اظہار خیال ہو اور آپ نے بہت اچھے موضوعات کو اس طرح سے پیش کیا کہ مجھے بھی آپ کی صحبت دوستاں کی خاطر اپنے ذاتی خیالات کو پیش کرنے کا موقع ملا بہت بہت شکریہ!

آپ دیکھ رہے تھے ریختہ فاؤنڈیشن کی بے حد خاص پیش کش روبرو محو گفتگو تھے مشہور ماہر اقبالیات محقق نقاد اور استاد پروفیسر عبدالحق۔

جون پور: اقبال شناسی کی شاہراہ کا سنگِ نشان

جون پور کی علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں کم یاب ہے اور دیر یاب بھی۔ مجموعی یافت کو پیشِ نظر رکھیں تو شاید ہی کوئی خطۂ زمین اس کا حریف ہو سکے۔ کرۂ ارض کے مشہور مفکر شاعر محمد اقبال سے بھی اس سرزمین کی نسبت دور کی ہی سہی مگر یہ دیار اقبال شناسی کی شاہ راہ کا ایک ناقابلِ فراموش سنگِ نشاں ہے۔ اقبال نے جہاں جہاں قدم رنجہ فرمایا وہ زمین رشکِ آسماں بن گئی۔ اہلِ شوق نے اس نسبت کو کتابوں میں محفوظ کر کے راہِ کہکشاں کی یاد تازہ کر دی۔ اقبال اور حیدر آباد، اقبال دہلی، اقبال اور بھوپال، اقبال اور اورنگ آباد، اقبال اور الہ آباد، اقبال اور کشمیر، اقبال اور افغانستان، اقبال اور یورپ میں وغیرہ جغرافیائی علاقوں کے تعلقات کی تاریخ قلم بند ہو گئی۔ علامہ کی یہ خوش بختی تھی کہ انہیں کئی ممالک اور مختلف شہروں کے مشاہدات کا موقع ملا۔ بقول آبرو دہلوی ؎

دامنِ دشت کیا نقشِ قدم سے گلزار
کس بہاراں کا یہ دیوانہ تماشائی ہے

اقبال اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے کئی براعظموں کی سیاحت کی۔ دوسرے اعتبار سے وہ دنیا کے سب سے ممتاز فن کار ہیں جن کے کلام میں متعدد مقام اور اعلام و آثار کے کثرت سے حوالے موجود ہیں۔ یہ ہماری شعری ثقافت کا بڑا اعزاز ہے کہ اردو سخن وری کے سرمایۂ تخلیق میں کرۂ زمین کے حوادث و حالات کے وقیع اور کثیر اشارات

محفوظ ہیں۔فارسی سے قطع نظر اردو کلیات میں دنیا کے ایک سو گیارہ مقامات مذکور ہیں۔کئی شہر و مقام ایسے ہیں جن کا بیسوں بار ذکر ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال کو شیرازِ ہند کے دیارِ مشرق سے خاص التفات ہے۔اعظم گڑھ، الہ آباد، جون پور اور بنارس پیشِ نگاہ ہیں جون پور و اعظم گڑھ کا شعری حوالہ مفقود ہے۔بنارس کا ذکر 'اسرارِ خودی کی حکایتِ شیخ و برہمن و مکالمہ گنگا و ہمالہ' کے پہلے شعر میں موجود ہے۔

در بنارس برہمندے محترم
سر فروانداریم بود وعدم

اکبر کے نام خط میں موجود شعر میں الہ آباد کا حوالہ ہے

اثر یہ تیرے انفاس مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد ہے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

اس نواح کے چند ذی علم احباب سے اقبال کے ذاتی مراسم تھے۔اکبر الہ آبادی علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، رشید احمد صدیقی، وغیرہ کے نمایاں نام ہیں۔اقبال کے مختلف خطوط میں جون پور کا بارہا نام آیا ہے۔اسرارِ خودی کی تخلیق کے درمیان زمان و مکان کے مباحث سے اقبال کا گہرا سروکار تھا۔اسرار میں ''الوقت سیفٌ'' عنوان کے تحت اس پیچیدہ مسئلے پر اشارہ ہے اور حدیثِ پاک کو تلمیح کے طور پر فکری فیضان کا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔روز و شب کی گردش اور انقلاب قابلِ دید و غور و فکر ہے۔ہم روز و شب کے اسیر ہیں۔اپنے قلب میں ایک عالم پنہاں کو بہ غور دیکھنے کی ضرورت ہے۔گردشِ آفتاب وقت کی حقیقت نہیں ہے۔وقت لازماں ہے۔نبی آخر الزماںؐ کا فرمان ہے کہ زندگی اور زمانہ دونوں ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔زمانے کو برا نہ کہو۔

گردشِ گردونِ گرداں دیدنی است انقلابِ روز و شب فہمیدنی است
اے اسیرِ دوش و فردا در نگر در دلِ خود عالمِ دیگر نگر

اصلِ وقت گردشِ خورشید نیست　　وقت جاوید است وخود جاوید نیست
زندگی از دہر ودہر از زندگی است　　لاتسبو الدھر فرمان نبی ؐ است

اقبال اپنے فلسفۂ زماں ومکاں کی تشکیل وتوسیع کے لیے بہت کوشاں تھے ۔مختلف علما کوخطوط لکھتے رہےاور کتابوں کی تلاش وحوالہ کا سلسلہ جاری رہا۔اسی سلسلے میں جون پور میں لکھی گئی بیش بہا کتاب 'شمشِ بازغہ' ہے اس کے حصول اور مطالعہ کے لیے اقبال نے علومِ اسلامی کی جوئے شیر کے فرہاد سید سلیمان ندوی کوخطوط لکھے خط مورخہ ۸/اگست۱۹۳۳ء میں جون پور کا نام آیا ہے۔

''ہندوستان میں بڑے بڑے اشاعرہ کون کون سے
ہیں اور ملا محمود جون پوری کو چھوڑ کر کیا اور فلاسفہ بھی
ہندوستان میں پیدا ہوئے ۔ان کے اسماء سے مطلع
فرمایئے ۔''[۱]

(کلیاتِ مکاتیبِ اقبال ص۔۳۶۸)

مجموعہ مکاتیب میں 'شمشِ بازغہ' کا کئی بار ذکر آیا ہے۔جیسے صفحہ۴۴۷اور صفحہ۹۷۸ پر اس کتاب کا تذکرہ ہے۔

(کلیات مکاتیبِ اقبال)

جون پور میں لکھی گئی ملا محمود کی یہ کتاب اسلامی فکر وفلسفہ کی بڑی اہم تصنیف ہے جو مدتوں سے اسلامی مدارس اور دانش گاہوں میں شاملِ نصاب رہی ہے۔دوسرے خطوط میں بھی جون پور کا نام درج ہے ۔سید سلیمان ندوی کے نام ایک دوسرے خط مورخہ ۷/مارچ۱۹۲۸ء میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے۔

''مخدومی السلام علیکم ۔شمشِ بازغہ یا صدرا میں جہاں
زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے گئے
ہیں ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمانہ خدا ہے ۔بخاری

میں ایک حدیث بھی اس مضمون کی ہے۔''۲

اکبرالہ آبادی سے اقبال کی گہری محبت اور عقیدت تھی۔ان سے ذاتی مراسم بھی تھے ۔ وہ اکبر کے شعری اسالیب کے ادا شناس تھے ۔خطوط میں اس وابستگی کے وافر اشارات موجود ہیں۔۱۹۳۰ء کے تاریخ ساز خطبہ کے موقع پر مزار اکبر پر حاضری دی تھی ،اس کانفرنس میں شرکت کے لیے الہ آباد حاضر ہوئے تو علامہ نے نواب محمد یوسف کے مکان پر قیام کیا۔یہ جون پور کے نواب تھے۔آج بھی ان کے نام پر جون پور شہر میں ایک مشہور شاہراہ ہے ۔ یہ ایک صاحبِ ثروت اور ملی کاموں میں پیش پیش رہنے والے مخلص انسان تھے ۔وہ صوبائی اسمبلی کے رکن اور اتر پردیش کی سرکار میں وزیر کے منصب پر بھی فائز رہے۔علامہ اقبال کو مسلم لیگ کے جلسہ گاہ تک پہنچانے میں نواب محمد یوسف نے ہی رہبری کی تھی ۔جون پور کے ایک بزرگ عالم مولانا عبداللہ عمادی (متوفیٰ ستمبر ۱۹۴۷امرتھوا) سے بھی اقبال کے تعلقات تھے ۔یہ جون پور کی تحصیل کراکت کے ایک گاؤں امرتھوا کے باشندہ تھے۔مولانا عمادی اقبال کے بڑے قدر شناس ذی فکر عالم دین تھے ۔علامہ کے خط سے ان کے گہرے روابط کا اندازہ ہوتا ہے ۔مولانا نے عربی کی کئی مشہور کتابوں کے اردو تر جمے کیے ہیں تاریخ 'طبری' طبقات ابن سعد، تاریخ یعقوبی وغیرہ ان کے اردو تراجم ہیں ۔انھوں نے مولانا عبدالعلی مدراسی ،مولانا فاروق چریا کوٹی ،مولانا شبلی ،مولانا سید سلیمان ندوی ،مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کی علمی صحبتوں سے فیض اٹھایا ہے۔وہ الندوہ وکیل الہلال اور زمیندار اخباروں کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔

وہ آخر میں دارالترجمہ حیدرآباد سے وابستہ ہوئے اصطلاحات سازی میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی وہ علم وعمل کے بے مثال پیکر اور خوش اخلاق انسان تھے ۔زمیندار لاہور کی ادارت کے زمانے میں علامہ اقبال سے قربت حاصل ہوئی ۔ان کے ساتھ نشستوں میں شریک ہوکر علامہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔اقبال شناسی میں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔کیوں کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اقبال کے پہلے اردو شعری مجموعہ کلیاتِ اقبال مطبوعہ عماد پریس حیدرآباد پر ۱۹۲۴ء مقدمہ لکھا۔گو یہ مقدمہ اقبال کے علم

میں لائے بغیر لکھا گیا تھا۔ اقبال کے ایک مخلص نیاز مند مولوی عبدالرزاق حیدرآبادی نے اخبار ورسائل میں شائع اردو کلام کو مرتب کر کے ۱۹۲۴ء میں کلیاتِ اقبال کے نام سے شائع کیا۔ علامہ کو اس اشاعت پر اعتراض ہوا اور انہوں نے عدالتی چارہ جوئی کر کے اس پر پابندی عائد کرادی۔ مولوی عبدالرزاق کی خواہش پر مولانا عبداللہ عمادی نے مقدمہ لکھا۔ جو علامہ کے شعری مجموعہ پر رقم کردہ پہلا مقدمہ ہے۔ اس کے بعد بانگِ درا (۱۹۲۴) پر شیخ عبدالقادر نے دوسرا مقدمہ لکھا۔ ان دونوں مقدموں کے علاوہ اقبال کے کسی شعری مجموعہ پر تقریظ نہیں ہے۔

جون پور کے مولانا عمادی کو یہ شرف حاصل ہے کہ کلام اقبال پر سب سے پہلے تقریظ ان کے قلم سے رقم کی گئی اگر شیخ عبدالقادر کو نظر انداز کر دیں تو مولانا کا مقدمہ کلام اقبال پر آخری تبریک بھی ہے۔ یہ مقدمہ مولانا عمادی کی اقبال شناسی اور علمی قدردانی کی روشن دلیل ہے۔ جو سرزمینِ شیراز کے ایک عالم کے نوکِ قلم سے وجود میں آئی۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ عبداللہ عمادی کی جوہر شناسی ہے اور اقبال کے شعر و پیغام کے لافانی ولازوال اقدار کو آفاقی منظر نامہ میں پیش کرنے کا حرفِ آغاز ہے۔ گویا اقبال کے جہاں آشوب نغمہ اور رازِ درونِ کائنات کی تفہیم کی پہلی کوشش جون پور کے نوشتہ تقدیر میں رقم کی گئی تھی۔ اس مقدمہ کی ناگزیر اہمیت اور دل کشا تاریخی تحریر کے پیشِ نظر اسے بارِ دگر نقل کیا جا رہا ہے ۔ کیوں کہ کلیات اردو کے ساتھ یہ مقدمہ بھی اقبالیات میں نادر و نایاب دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ عبدالقادر اقبال کے ہم وطن تھے اور دوست بھی۔ مولانا مشرق دور دراز علاقے کے باشندے تھے مگر ذہنی وفکری رشتہ و پیوند میں اقبال کے ہم نشین وہم نوا تھے۔

''چکیدۂ کلکِ جواہر سلک علامہ عبداللہ العمادی رکن ومنصرم ناظرِ کتب مذہبی دارالترجمہ سرکارِ عالی''

آج جب کہ ہماری شاعری گرفت وگیر کی نزاکت میں عیارانہ مشاقی پیدا کرنے کے لیے ''اس طرح کہ گھونگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے'' پر زور دے رہی ہے اور ''جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھالو'' کے فلسفہ کی عملی تعلیم دینے پر آمادہ ہے، سخن سنجی کو دعویٰ ہے کہ واعظ کے مونھ پہ مہر لگادوں کباب کی'' اور سخن سنج یہ مستزاد الاپ رہا ہے کہ ''داڑھی کو

دیا اس کے لگا بزقتونا۔ اور بجنے لگی گت'' اس وقت یہ عرض کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ ہماری یہی شاعری کبھی ملکی وقومی اغراض کے تابع تھی اور اسلام کی علم برداری کا کام اس نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ انتقام اہل بیت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کمیت سے ایک قصیدہ لکھاتا ہے جس کے اثر سے دمشق سے لے کر اندلس تک تلواریں چل جاتی ہیں، دولتِ بنی امیہ کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور عباسیوں کے لیے پیش قدمی کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ ابراہیم بن المہدی ایک قصیدہ سناتا ہے اور نصرانیت سے اسلام کا انتقام لینے کے لیے تمام بغداد قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا ہے۔

یہ عربی شاعری کا انداز تھا جس سے افسوس ہے کہ ہمارے تعلقات آج کل دور جا پڑے ہیں لیکن فارسی بھی اس خصوص میں کچھ ایسی پیچھے نہیں، دیکھو، سنخوری کا دربار گرم ہے، عثمان مختاری ایران میں بیٹھا ہوا ہندوستان کے فتوحات نظم کر کے ایرانیوں کو جہاد کے لیے آمادہ کر رہا ہے، کمال اسماعیل کفر سے بدلہ لینے کی داد دیتا ہے۔ کہ ''تو داد منبر اسلام بستدی ہے زصلیب''، عمعق نجاری زوالِ دولتِ اصفہان کا مرثیہ کہہ کے قوم میں حرکت پیدا کرنا چاہتا کہ ''خاک خوں آلود اے باد باصفاہان'' برظہیر اگرچہ خاندان خوارزمشاہ کا موروثی مدّاح ونمکخوار ہے مگر خوارزمشاہ جب بغداد پر لشکر کشی کر کے انقلابِ خلافت کا ہنگامہ برپا کرنا چاہتا ہے اور شیخ شہاب الدین سہروردی (قدس سرہٗ) کی سفارت کو جو بغداد سے اُسے سمجھانے آئی ہے اپنے زعم میں ذلیل کر کے واپس کرتا ہے تو غیظ وغضب کے عالم میں طنز کے طور پر ظہیر کے اسلامی جذبات اس کو یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ:

شاہا عجم چو گشت مسلّم بہ تیغ تو — لشکر بہ سُوئے خوابگہِ مصطفٰے فرست
پس کعبہ را خراب کن ونادداں بساز — خاکِ حرم چو ذرّہ بسوئے ہوا فرست
از کعبہ جامہ باز کن ودر خزانہِ نہ — وانگاہ روضہ را دوسہ گز بوریا فرست
تا کافری تمام شود پس بہ کرخ رو — وانگہ سرِ خلیفہ بسوئے خطا فرست

غزّ وں کا وحشی گروہ سلطان سنجر کو گرفتار کر کے خراسان کو لوٹ لیتا ہے خراسانیوں میں تو دم نہیں مگر انوری اپنے اہتمام سے ایک سفارت دیتا ہے جس کے صدر امیر کمال

الدین بنائے جاتے ہیں اور وہ سمرقند پہنچ کر، جہاں کے حکمران ملک ضیاء الدین ہیں، ایران کی تباہی پر تورانیوں کو غیرت دلانے کے لیے انوری کا یہ قصیدہ سناتے ہیں جس کے چند شعر آپ بھی سُن لیں ؎

خبرت نیست کہ از ہر چہ درو چیزے بود　　در ہمہ ایراں امروز نمانداست اثر
بر بزرگان زمانہ شدہ خرداں سالار　　بر کریمان جہاں گشتۂ لئیماں مہتر
بر درِ دُوناں احرار حزین و حیراں　　در کفِ رنداں ابرار اسیر و مضطر
مسجدِ جامع ہر شہر ستورِ شاں را　　پایگا ہیست کہ نہ سقفش پیداست نہ در
خطبہ نکند بہر خطہ بنام غز، ازانکہ　　در خراساں نہ خطیب است کنوں نے منبر
کُشتہ فرزند گرامی واگرنا گاہاں　　بیند ازبیم خروشید نیارو ماور
ہست در روم وخطا امن مسلماناں را　　نیست یک ذرّہ سلامت بہ مسلمانی در
بر مسلماناں زاں گونہ کنند استخفاف　　کہ مسلماں نکند صد یک ازاں برکافر
رحم کن رحم براں قوم کہ نبود شب وروز　　در مصیبت شاں جز نوحہ گری کار دگر
رحم کن رحم براں قوم کہ جویند جویں　　از پسِ آنکہ نخوروندے از ناز شکر
رحم کن رحم براں قوم کہ رسوا گشتند　　از پس آنکہ بزیبائی بودند سَمَر
رحم کن رحم برآنہا کہ نیابند نَمدُ　　از پسِ آنکہ ز اطلس بودے بستر
وقت آن است کہ یا بند ز رحمت زنہار　　گاہ آن ست کہ گیرند ز تیغت کیفر
ہمہ پوشند کفن چوں تو بپوشی خفتاں　　ہمہ کواہند اماں چوں تو براری مغفر

اردو اگرچہ بہت دیر کے بعد اس شاہ راہ ملی پر گرم رَو ہوئی ہے مگر اقبال کی قیامت کی چال نے اس تاخیر کی تلافی کر دی اور اب اردو کو بھی یہ کہنے کا موقع ملا کہ ’’اگر دیر آمدم شیر آمدم شیر‘‘ مسلمانوں پر جو وقت اب آ پڑا ہے زوالِ تمدنِ عرب کی صدیوں میں بھی یہی بلا دست وگریباں تھی، شاعری نے اس زمانہ میں بھی تحریک بیداری کی سربراہ کاری اپنے ذمہ لی تھی مگر یاس اتنا غالب تھا اور قنوط نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اب اسلام کی عظمت سابقہ تو عود کر سکتی نہیں، مسلمانوں کے پاس جو کچھ رہ گیا ہے یہی بچا رہے تو بہت

ہے۔اس عہد کی شاعری اسی نظریہ پر زور دیتی ہے اور کہتی ہے۔

طمع مدار کہ کُفّار بشکنند صلیب

بس است ایں کہ نہ بندند مومناں زُنّار

لیکن اقبال کا دل وحیِ اِلٰہی کا آئینہ دار ہے، کشف غطاء نے اس کے سامنے سے آسمان وزمین کے پردے اٹھادیئے ہیں اور اس کو صاف نظر آرہا ہے کہ ۵۷۰ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نظامی نے مخزن اسرار میں جو فریاد کی تھی اس چودھویں صدی میں وہ دُعا مستجاب ہونے کو ہے۔توحید کی عن قریب آنے والی عظمت کا نظّارہ اس کے روبرو ہے۔اور وہ ''محو حیرت ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی'' ہر ایک اسلامی زبان کی شاعری میں یہ خصوصیت اقبال ہی کے لیے ودیعت تھی اور دنیا بھر میں یہی ایک حسّانُ الہند ہے جو گوری شنکر (ایورسٹ) سے لے کر پرینیز تک کی چوٹیوں پر اِعلائے لوائے نبوی کے لیے قوم کو آمادہ کررہا ہے۔

ہندوستان کو دکن کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ اس کے بہترین فرزند مولوی عبدالرزاق صاحب ایچ۔سی۔ایس کے جذبات ملّی اس مدوّنۂ حکمت ودیوان رسالت کو منصۂ شہود پر لارہے ہیں۔

(مورخہ ۲۴ر ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ مطابق ۲۸ر جون ۱۹۲۴ء)

مولانا عمادی کے فکر انگیز خیالات میں اقبال کی عبقری شخصیت کا اعتراف پہلی بار معرضِ اظہار میں آیا ہے۔اقبال کے دل کو وحیٔ الٰہی کا آئینہ دار کہنا بڑی جرأت وجسارت کی دلیل ہے۔نظامی کی دعاؤں کے مستجاب ہونے کا نظارہ کلام اقبال میں فروزاں ہے دنیا کی تمام اسلامی زبانوں میں اقبال کی عظمت کا اقرار بھی خوب ہے۔اقبال کو حسان الہند اور اعلائے بوائے نبویؐ کا مینارۂ نور کہنا مولانا کے فکر ونظر کی بلوغت اور فرزانگی کی روشن دلیل ہے۔

اقبال مولانا عمادی کے علم واخلاص کے قدردان اور معترف تھے۔۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۸ء لکھے گئے۔سرکش پرشاد شاد کے نام خط میں اقبال نے سفارشی تحریر کے ساتھ ان کے

علم وفضل کی تعریف کی ہے۔جس سے اقبال کے گہرے اور سرپرستانہ مراسم کا اظہار ہوتا ہے۔دوسرے خطوط کے علاوہ یہ ایک غیر مطبوعہ خط ہے جو اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے ترجمان اقبال ریویو میں اپریل ۲۰۰۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔اس نادر تحریر کی اہمیت کے پیشِ نظر خط کا متن پیش کیا جارہا ہے۔تاکہ دونوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت نمایاں ہوسکے۔

مولانا عبداللہ عمادی کے نام مکتوب کا متن)

لاہور ۱۰/اکتوبر ۲۹۱۸

ڈیر مولوی صاحب، السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

مجھ کو آپ کا خط پڑھ کر تعجب ہوا کہ آپ کو ایسے واقعات پیش آئیں، جن کا اشارہ آپ نے کیا ہے۔افسوس ہے میری ملاقات مسٹر حیدری سے نہ ہوسکی۔انہوں نے علی گڑھ سے مجھے تار دیا تھا، مگر میں لاہور میں نہ تھا شملہ میں تھا۔۲۳ ستمبر کو شملہ سے آیا تو ان کا تار ملا۔اس اثناء میں وہ علی گڑھ سے روانہ حیدرآباد ہوچکے تھے۔اگر ان سے ملاقات ہوجاتی تو میں آپ کے بارے میں خاص طور پر ان سے ذکر کرتا۔لیکن مجھے یقین ہے کہ اہلِ حیدرآباد آپ کے علم وفضل سے جلد واقف ہوجائیں گے اور آپ کے وجود کو غنیمت تصور کریں گے۔آپ کے چلے جانے سے لاہور کی علمی صحبت کا خاتمہ ہوگیا۔ڈاکٹر اعظم الدین بھی شاید چلے جائیں، بس پھر بقول مولانا اکبر:

''یہاں دھرا کیا ہے سوا اکبر کے اور امرود کے''

مولوی ظفر علی خاں صاحب سے شملہ میں ملاقات ہوئی تھی۔اب وہ کرم آباد میں ہیں۔لوگ چونکہ پہلے سے ان کی نسبت بدظن ہیں ان کے حیدرآباد سے واپس آجانے کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ایک حیدرآبادی راوی نے ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا یعنی یہ کہ وہ حضور نظام کے دربار میں ''یا امیر المسلمین'' کا نعرہ مار کر بیہوش ہوگئے تھے۔راوی کے طرزِ بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب کی بے بیہوشی مصنوعی

تھی۔واللہ اعلم میں نے ان کو کہا بھی تھا اور جاتے دفعہ کہہ بھی دیا تھا وہ حیدرآباد میں سوائے اپنے کام کے اور کسی سے سروکار نہ رکھیں، مگر افسوس کہ میری نصیحت پر عمل نہ کر سکے اور نتیجہ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔

کیا خوب آپ مجھے حیدرآباد کھینچتے ہیں یا میرے حیدرآباد آنے کے متوقع ہیں۔ میں اس فکر میں ہوں کہ آپ لاہور آجائیں کہ لاہور میں علمی چرچا آپ کے دم سے تھا۔ مولوی وجاہت حسین آپ کو آفتاب کی ایڈیٹری کے لیے بلانا چاہتے تھے، شاید انہوں نے آپ کو لکھا بھی ہو۔ میری کوشش ہے کہ آپ کو لاہور سے اسلامیہ کالج میں یا حمیدیہ کالج میں جس کا نصاب زیرغور ہے کوئی پروفیسری مل جائے۔ بہرحال جو خدا کو منظور ہوگا ہو رہے گا۔ مولوی صدرالدین پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور کو میں نے اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ گولزیر نے.....جو تنقید کی ہے اسے اردو میں ترجمہ کر ڈالیں۔ اگر آپ یہاں ہوتے تو گولزیر کی تنقید کی تردید میں آپ سے گراں بہا مدد ملتی۔ تاہم جو کچھ مجھے معلوم ہے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر کر دیا جائے گا۔ حیدرآباد میں کہیں خواجہ کرمانی کے دیوان کا قلمی نسخہ ملے تو مطلع کیجئے کہ آیا قیمتاً مل سکے گا یا مالک نسخہ نقل کر لینے کی اجازت دے گا۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ کیا آپ مہاراجہ سرکشن پرشاد سے بھی ملے؟ وہ بھی اہل علم کے بڑے قدرداں ہیں۔ لاہور میں سردی آرہی ہے، اب شہر کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔

عبدالحکیم صاحب کو آپ کا پیام دے دیا جائے گا۔ وہ کل شام یہاں آئے تھے، مگر افسوس کہ میں مکان پر موجود نہ تھا۔

مخلص

محمد اقبال

اقبال کی نظر میں مولانا کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ وہ بہتر سے بہتر صورتِ حال کے لیے خواہش مند تھے۔ مہاراجہ کرشن پرشاد شاد کے نام ایک دوسرے خط مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۱۶ء میں اقبال نے مولانا عمادی کے مناقب کا پرخلوص اظہار کیا ہے۔ اقبال کی یہ تحریر

ایک سند ہی نہیں بلکہ جذبہ واحساس کا ایک گراں قدر دستاویز ہے اقبال کا مولانا کے لیے یہ سفارشی خط سرکار عالیہ نظام حیدرآباد دکن کے وزیر اعظم کو لکھنا علامہ کی عقیدت ومحبت کا درجۂ کمال ہے:

''ایک عریضہ اس سے پیشتر ڈاک میں ڈال چکا ہوں ۔آج پھر عریضہ لکھنے کی ضرورت پیش آئی ۔ مجھے یاد ہے کہ سرکار نے یا مجھے لکھا تھا یا زبانی ارشاد فرمایا تھا کہ ایک قابل آدمی کی ضرورت ہے ۔جو سرکار کے مشاغل تصنیف وتالیف میں مدد ومعاون ہو۔ میں تلاش میں تھا ۔آخر ایک آدمی مل گیا ہے ۔یعنی مولانا عبداللہ عمادی ۔ جو نپور کے رہنے والے ہیں لاہور میں ایک عرصہ سے مقیم ہیں ۔عربی وفارسی میں ان کی لیاقت اعلیٰ درجے کی ہے ۔اور اردو نثر نویسی میں ان کا طرز تحریر جدت رکھتا ہے ۔علوم اسلامیہ میں ان کی مہارت کامل ہے اور ان کی پرائیویٹ زندگی بالکل بے داغ ہے ۔ پنجاب کے بعض اخباروں کی ایڈیٹری بھی کر چکے ہیں مثلاً وکیل ،زمیندار ولمعات وغیرہ ۔غرض کہ نہایت قابل آدمی ہیں ۔ میرے خیال میں ان سے بہتر آدمی سرکار کو نہ مل سکے گا ۔تنخواہ ان کو ڈیڑھ دوسو روپیہ ملتی رہی ہے ۔اگر سرکار کو ضرورت ہو اور ان کو پسند فرمائیں تو تنخواہ کے متعلق گفتگو کرلوں گا زیادہ کیا عرض کروں ۔اس خط کا

مقصد صرف یہی اطلاع تھی جو اوپر عرض کر چکا ہوں۔''

(بحوالہ شاد اقبال)

دوسرے خطوط میں بھی مولانا کا ذکر ایک تعلق خاطر کا مظہر ہے۔ دوسری طرف مولانا عبداللہ عمادی بھی ہر دور میں اقبال کی قدر شناسی کو حاصلِ زندگی جانتے رہے۔

۱۹۱۵ء میں اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد بعض کم نظر اور نام نہاد صوفیوں نے خواجہ حافظ کی تنقید کے خلاف ایک محاذ قائم کیا جن میں خواجہ حسن نظامی پیش پیش تھے۔ ان مخاصمانہ تحریروں کے جواب میں مولانا عبداللہ عمادی نے اقبال کے موقف کی پرزور تائید میں مضامین قلم بند کیے جو زمیندار میں شائع ہوئے۔

اقبال نے ایک خط میں مولانا عمادی کو مخاطب کرتے ہوئے اکبر کا شعر لکھا تھا:

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

''لیکن یہاں لاہور میں نہ تو اکبر ہیں نہ امرود۔ ایک اقبال ہے وہ بھی برائے نام''

مولانا عمادی نے جواب میں تحریر کیا تھا کہ پنجاب کی سرزمین قابلِ احترام ہے جہاں اقبال بستے ہیں جن کی قسمت پر اقبال مندی بھی نازاں ہے۔

تجھ پر اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں
اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالا مال ہے
ہم نے مانا تو نہیں مسحورِ تہذیبِ فرنگ
تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام ہے اقبال ہے

اقبال کے تعلق سے مولانا کی شعری تخلیق کی ایک اور مثال قابلِ ذکر ہے۔ اقبال کا مشہور قطعہ ہے۔

جس میں ان کے سوز و سازِ زندگی کا گداز اور سفرِ زندگی کے اختتام کا اشارہ ہے۔ اقبال کی وفات پر مولانا عمادی نے اس قطعہ کا ترجمہ کر کے اپنے رنج و غم کا اظہار کیا تھا۔

سرودِ دل نواز آئے نہ آئے
پھر اب بوئے حجاز آئے نہ آئے
زمانہ اس گدا کا ہوگیا ختم
کوئی دانائے راز آئے نہ آئے

اقبال کے مشہور قطع کا متن پیشِ نظر ہے

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روز گارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

سرشاہ سلیمان (۱۹۴۱۔۱۸۸۶ء) بھی علامہ کی خط وکتابت تھی ان کے والد اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے وہ جون پور منتقل ہوگئے تھے اور وکالت سے وابستہ تھے ۔۶/اکتوبر ۱۹۳۷ء کے خط میں اقبال نے اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کی ملازمت کے لیے سفارش کی تھی۔اقبالیاتی مطالعہ میں ایک مقتدر اور محترم شخصیت پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۹۷۷۔۱۹۹۷) کی ہے جو پروفیسر ہی نہیں اردو کے نا قابل تقلید انشا واسالیب کے بے مثل صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ایک صدی تقریباً گزرنے کو ہے مگر ان کے طرزِ تخلیق پر کسی تحریر کو سبقت حاصل نہ ہوسکی۔گوان کی ادائے خاص کی تقلید وتلاش میں فن کو فرزانگی حاصل ہوئی اور تنقید وطنز کی گزرگاہیں فروزاں بھی ہوئیں۔رشید احمد صدیقی کے فکر وفیضان کی نسبتیں علامہ اقبال سے استوار ہوتی ہیں۔رشید احمد صدیقی کی طرح اردو کے کسی ادیب کی تحریر میں اقبال کے فکری اسالیب کا ایسا گہرا نقش مشکل سے ملے گا وہ اردو کے پہلے استاد وادیب ہیں جنہوں نے علامہ کی حیات میں ان کے فکر وفن پر مقالات قلم بند کیے۔پنجاب سے باہر رشید احمد صدیقی پہلے استاد ہیں جس سے علامہ کے اتنے گہرے اور معتبر ذاتی مراسم قائم ہوئے۔ان پر اقبال کو اتنا اعتماد تھا کہ گھریلو معاملات کی ذمہ داری بھی رشید

صاحب کے سپرد کی ۔ بچوں کی نگہداشت کے لیے بھی ان کا انتخاب کیا ۔علامہ رشید صاحب کے اسلوب وانشا کو بھی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے ۔رشید صاحب کا وفورِ شوق دیکھیے کہ تیس تیس سال کی عمر میں ۱۹۲۹ء میں علامہ سے ملنے لاہور کا سفر کیا ۔اقبال کے فیضان سے دامنِ دانش کو گہر بار کیا ۔اقبال کی محبت دیکھیے کہ رشید صاحب کی تخلیقی نمود کا انھیں بھرپور احساس تھا۔وہ رشید صاحب کے اسالیب تحریر کے قدر دان تھے ۔علامہ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ لکچر دینے کے لیے تشریف لائے تو رشید صاحب کی عیادت کے لیے ان کے گھر قدم رنجہ فرمایا۔ رشید صاحب بیماری کے سبب لیکچر میں حاضر نہ ہو سکے تھے ۔ خط وکتابت کا سلسلہ تادمِ آخر قائم رہا۔اس تعلق میں اضافہ ہوتا رہا۔ رشید صاحب کی تمام تحریریں فکر اقبال کی ترجمان بنتی گئیں ۔ذہن وفکر کے یہ مناسبات عجیب ہیں اور غریب بھی ۔کسی ادیب وانشا پرداز کی تحریر میں اشتراکِ فکر کے یہ اشارات نہیں ملتے ۔رشید احمد صدیقی نے اقبال کے علوئے فکر کی ارتفاعیت کو جس طرح قلم بند کیا وہ کسی سے نہ ہوسکا ایک عبارت ملاحظہ ہو:

> ''رسول اکرمؐ کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی افلاطونِ عہد،
> صاحبِ سریر وسلطنت یا اربابِ شریعت وطریقت کا
> نہیں بلکہ اردو کے ایک شاعر اقبال کا انتخاب کیا۔جس
> نے پیغمبری کی لیکن پیغمبر نہیں کہہ سکتے۔''
>
> (علی گڑھ کی مسجد قرطبہ)

رشید احمد صدیقی کا جذب وشوق تھا کہ انھوں نے علامہ کی حیات میں ہی ان کے فکر وفن پر اپریل ۱۹۲۶ء میں طویل مقالات تحریر کیے۔ جو دو قسطوں میں رسالہ 'سہیل' علی گڑھ میں شائع ہوا۔ گویا اردو کے صاحبِ طرز ادیب اور پروفیسر کے قلم سے یہ پہلی تحریر تھی ۔اس مقالے کی آخری عبارت ملاحظہ ہو:

''اقبال کی شاعری اوران کے افکار کے سمت ورفتار کے
مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال نے فن کے
رموز، زبان کی اہمیت اور شاعری میں فکر، جذبہ اور تخیل
کے مقامات پہچاننے میں کتنا ریاض کیا تھا۔ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ جیسے شاعری نے اقبال کو اقبال بنانے میں
اپنی ساری آزمائش ختم کردی ہو۔اوران کے بعدان پر
اپنی ساری نعمتیں بھی تمام کردی ہوں۔جیسے اردو شاعری
کا دین اقبال پر مکمل ہوگیا ہو۔''

(پیام اقبال کراچی۔ص ۶۵)

اقبال کے فلسفۂ شعر کو ابھی ک تنقید وتحسین کی یہ بلندی اور خیال افروزی نہیں مل سکی تھی۔رشید احمد صدیقی کی بیشتر تحریروں میں اقبال کی شخصیت اور شاعری کی جو خراج پیش کیا گیا ہے وہ انتقادی ادب میں نایاب ہے۔''عزیز انِ ندوہ کے نام'' کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

'' اقبال کا کلام حیرت انگیز حد تک ہر طرح کے
حشوو زوائد اور رسمی وروایتی تکلفات سے پاک
ہے.....اقبال نے اپنی اعلیٰ تخلیقات کے لیے 'عبارت'
اشارت اور ادا'' کے جیسے برمحل، حسین اور بے مثل پیکر
تراشے ہیں یا صوت وساز وضع کیے ہیں وہ بجائے خود
اقبال کے غیر معمولی حسن آفریں اور حسن کار
جبیں Genius ہونے کی دلیل ہے۔اس وادی میں
بھی اقبال کا ہمسر کوئی دوسرا شاعر نہیں۔''

(عزیز ان ندوہ کے نام لکھنؤ ۱۹۶۷ء ص۔۶۸)

رشید احمد صدیقی نے اقبال کی تنقید و تفہیم کے لیے جو جملے تراشے ہیں یا وضع کیے ہیں وہ بہت ہی فکر انگیز اور دل و نظر کو غور و فکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انھیں سرسری نہیں پڑھا جا سکتا۔ ایسے جملے اپنی معنوی تہہ داری اور گہرائی کے لیے اردو تنقید میں بے مثل و بے عدیل ہے۔ یہ رشید احمد صدیقی کی فکر انگیز تحریروں کی ادائے خاص ہے۔ جو ٹھہر کر پڑھنے اور غور و فکر کا تقاضا کرتے ہیں۔ اقبال تنقید میں ان خیال افروز جملوں کی بڑی معنویت ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

''مسجد قرطبہ کو اردو نظموں کی مسجدِ قرطبہ کہیں تو بے محل نہ ہوگا۔''

''اقبال نے اردو شاعری کو نسب ہی نہیں حسب بھی دیا''

''اقبال کی غزلوں کے سامنے ہم بے ادب یا بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اقبال نے غزل کی بزمیہ کو رزمیہ کے درجے پر پہنچا دیا۔ اقبال کی نظموں کا شباب اقبال کی غزلوں کے شراب میں ڈوبا ہوا ہے۔ غزل نے جب تک اقبال سے ترکِ نسب نہیں کرالیا اپنی بارگاہ میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ غزل صرف اپنے نسب کا احترام کرتی ہے۔''

''اقبال کی نظموں میں غزل کی اور غزل میں نظموں کی خوبی اور خوش نمائی ملتی ہے۔''

رشید احمد صدیقی ذاتی وابستگی کے باوجود اقبال پر کوئی کتاب نہ لکھ سکے ان کے مضامین اور بکھری تحریروں کو جمع کر کے ڈاکٹر لطیف الزماں خان نے پیام اقبال کے نام

سے ایک مختصر کتاب شائع کی ہے۔

جون پور کے ان بزرگوں کی اقبال شناسی کے بعد نئی نسل کے مطالعہ اور حصول علم کا سلسلہ شروع ہوا۔ دانش گاہوں میں خصوصی مطالعہ کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی سند کے لیے بھی آغاز ہوتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جون پور سے منسلک سرحد ضلع اعظم گڑھ کے مولانا عبدالسلام ندوی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ملک کی آزادی کے بعد علامہ کے فکر وشعر پر پہلی کتاب 'اقبال کامل' تصنیف کی جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی 'روح اقبال' مطبوعہ ۱۹۴۵ء کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی کی دوسری اہم کتاب ہے جو مقبول خاص وعام ہوئی۔ اس کے بعد مجنوں گورکھپوری کی کتاب ''اقبال'' گورکھپور سے شائع ہوئی سنہ اشاعت درج نہیں ہے ۱۹۵۵ء میں دہلی سے دوبارہ شائع ہوئی۔ جون پور کے تحصیل مچھلی شہر کے مضافات کے رہنے والے عبدالحق پہلے شخص ہیں جنہوں نے گورکھپور یونی ورسٹی سے ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ''اقبال کے ابتدائی افکار'' آزادی کے بعد شائع ہونے والا تحقیقی مقالہ ہے جو ۱۹۶۹ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ گویا جون پور کو یہ شرف حاصل ہے کہ اقبال شناسی کو دانش گاہوں کے ایوانِ تنقید وتحقیق تک رسائی حاصل ہوئی۔ اقبال کے ابتدائی افکار تنقید اقبال اور دوسرے مضامین فکر اقبال کی سرگزشت اقبال اور اقبالیات، اقبال کے شعری اسالیب، بکھرے خیالات، اقبال کی شعری وفکری جہات، اقبال شاعرِ رنگیں، اقبال کا حرفِ شیریں، اقبال کی فکری سرگزشت، اقبال اور آرزوئے انقلاب، اقبال کے دینی تصورات، اقبال کا نغمۂ جہاں آشوب (زیر اشاعت) سارے جہاں سے اچھا (مونو گراف)، علامہ اقبال (مونو گراف)، محمد اقبال (مونو گراف) نذر مشتاق، اقبال کی شعری وفکری جہات۔ جون پور کی اقبال شناسی کا یہ سرمایۂ تنقید وتفہیم قابل ذکر ہے اور ستائش بھی۔ دوسرے اقبال شناسوں کو شامل کرلیں تو کتابوں کی تعداد بیس ہوجاتی ہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ جون پور کے لیے اقبال شناسی بھی باعثِ افتخار وسعادت ہے کہ علامہ کی قدردانی میں یہ سرزمین احترام

واعزاز سے سرخرو ہے۔ یہ کہنے میں مضائقہ نہیں کہ اقبال شناسی کے سرمایۂ تنقید مین ایک بڑی تعداد ہے جو کسی ایک فرد کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ جون پور کی اقبال شناسی کی رہ گزر کی سب سے فروزاں مثال ہے۔ راقم کی نگرانی میں علامہ اقبال پر آٹھ مقالے لکھے گئے جنھیں ملک کی مایۂ ناز یونی ورسٹی دہلی سے سند تفویض کی گئی انھیں کی نگرانی میں ڈاکٹر فردوس جہاں نے ''شعرِ اقبال کا سیاسی وتہذیبی مطالعہ'' کے موضوع پر ڈگری حاصل کی۔ یہ جون پور کی رہنے والی خاتون ہیں۔ یہ مقالہ ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ ان کی دوسری کتاب اقبال کی امیجری بانگِ درا کی روشنی میں بھی ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر شائستہ نے پوروانچل یونی ورسٹی نے اقبال شناسی پر سند حاصل کی۔ اسی شہر کی ڈاکٹر افروز جہاں نے بھی 'اقبال کی شاعری میں عورت کا تصور' کے موضوع پر ۱۹۸۴ء میں دہلی یونی ورسٹی سے ایم۔ فل کا مقالہ لکھ کر سند حاصل کی۔ پروفیسر عبدالقادر جعفری مرحوم صدر شعبۂ فارسی وعربی الہ آباد یونی ورسٹی نے پروفیسر رفیق احمد کی نگرانی میں علامہ کی فارسی شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھا اور الہ آباد یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔

یہ سلسلہ ہنوز کسی نہ کسی صورت جاری ہے۔ بعض اہلِ قلم کی نگارشات نے اس موضوع کو فرزانگی بخشی ہے۔ ابھی دو ماہ قبل میرا پیام کے سترہویں شمارہ میں ابوذر انصاری نے انتساب میں شعرِ اقبال کی معانی آفرینی پر ایک منفرد مضمون شائع کیا ہے۔ جو غالباً اقبالیات کے ضخیم ذخیرہ میں یکتا ویگانہ ہے۔

> ''اقبال ہمارے شب وروز کی زندگی کا ناگزیر حصہ بن گئے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے ان کے اشعار محاورہ کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ بیشتر موضوعات اور مناسبات میں ان کے اشعار کی حکیمانہ معنی آفرینی ایک اعجوبہ ہے۔''

ایک عمومی مشاہدے کے مطابق انتساب میں ان کے

اشعار کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔اس مضمون
میں چند کتابوں میں موجود اشعار پر گفتگو کی گئی ہے۔
راقم نے چند برس قبل انتساب پر ایک مضمون سپرد قلم کیا
تھا اہل علم نے اس کی پذیرائی کی اور پسند فرمایا تھا۔
پسندیدگی کے پیشِ نظر سلسلۂ تحریر کا یہ دوسرا حصہ ہے۔ یہ
بات بھی قابل ذکر ہے کہ معروف اقبال شناس پروفیسر
عبدالحق کی کم وبیش پچپن تالیفات ہیں۔ چار پانچ
کتابوں کے علاوہ سبھی پر انتسابی تحریر موجود ہے۔ ہر
انتساب اقبال کے شعر یا مصرع سے مزین ہے۔اقبال
کے اشعار کی بوقلمونی اور وادیٔ خیال کی بے کراتی حیرت
انگیز ہے۔ پیشِ نگاہ پروفیسر عبدالحق کی چند کتابوں کے
انتساب پر گفتگو کی جارہی ہے۔ وسعتِ بیان کے لیے
تلاطم ہائے دریا کی دریابی درکار ہے۔ چند پر اکتفا کرنا
میری مجبوری ہے۔''

تصنیف وتالیف کے علاوہ شعری تخلیق اور فکری رویے میں بھی اقبال کے مؤثرات بہت نمایاں ہیں۔اقبال کے فلسفہ وشعر نے براعظم کے ذرۂ زمین کو بھی تحریک وتوانائی سے معمور کیا۔اردو کی پوری شعری فضا کو انقلاب آفریں تصورات سے سرشار کیا۔ جون پور نے بھی اقبال کے فیضانِ تخلیق استقبال کیا اور حق بھی ادا کیا۔ جون پور کی سرشت میں اقبال نوازی اور قدارشناسی کا جوہر قدرت نے بڑی فیاضی سے ودیعت کیا ہے۔اس کا اندازہ لگائیں کسی نہ کسی صورت اقبال کے شعر وپیغام کو فن کے پیروجواں نے خوش آمدید کہا۔اعتراف میں خوش آئند نغمہ سینے۔ جوشفیق جون پوری (۱۹۰۲۔۱۹۶۳) کے دل ونگاہ

کی دلبری اور بے لوث عقیدت کا برملا اظہار ہے۔

خدا رکھے شفیقِ جون پوری کو زمانے میں
اٹھا اقبال تو یہ دوسرا دانائے راز آیا
ہماری خود پسندی غیر کی تقلید کیا جانے
ہم اسے اقبال تیری پیروی پر ناز کرتے ہیں

شفیق کا دوسرا اقرار بھی قابلِ غور ہے۔شعری افتخار شعراء کا شیوۂ گفتار رہا ہے اس بیان سے ذہنی قربتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

سنا ہے روح القدس نے پوچھا تو روح اقبال نے یہ صدا دی
کہ شاعران وطن میں کوئی شفیق کا دوسرا نہیں

فکر وخیال کے علاوہ شعری اسالیب وآہنگ میں کہیں کہیں یہ تاثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ پرتو اقبال کی پرچھائیں ان کی تخلیق پر نمایاں نظر آتی ہے۔غزل ہو یا نظمیں ان میں اقبال کے لطیف اشارے بھی موجود ہیں۔مولانا سراج الحق سراج مچھلی شہری ایک ذی علم اور صاحبِ نظر عالم دین تھے۔قرآن وحدیث کے متن اور مباحث پر گہری نظر رکھنے والے اپنے دور کے ذی فکر صاحب بصیرت دانش ور تھے۔روشن خیال اور علوم جدید سے بھرپور آگہی بھی رکھتے تھے۔وہ الہ آباد کے گورنمنٹ کالج میں عربی وفارسی کے استاد تھے وہ شعروادب کا شائستہ وشگفتہ مذاق رکھتے تھے انھیں شعری بیانیہ پر ایک قدرت حاصل تھی۔ کئی جگہ اقبال کے استفادے اور اعتراف کے نمایاں نشانات موجود ہیں۔انہوں نے اسرارِ خودی کے اسلوب میں اقبال اور مولانا رومی کے تقابل میں ایک ترکیب بند تخلیق کی۔یہ نظم پہلی بار ۱۹۵۱ء میں الہ آباد سے شائع ہوئی تھی دوسری بار آگرہ سے اشاعت عمل میں آئی۔

یہ ''مناظر خودی'' کے عنوان سے ایک طویل نظم جس کے دو حصے ہیں۔پہلا حصہ نفیٔ خودی اور دوسرا احساسِ خودی پر مشتمل ہے۔ ہر دو حصے میں ۶۳/۶۳ اشعار ہیں پہلے

حصہ میں سات بند اور دوسرے حصے میں چھ بند اور ایک غزل ہے۔ دراصل یہ بکری اور شیر کا مکالمہ ہے۔ نظم پیامی ہے جس کا مرکزی نقطہ اقبال کے اس قول میں ادا کیا جا سکتا ہے۔

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مولانا سراج الحق مچھلی شہری کا قول ملاحظہ ہو

جنگاہ ہے یہ دنیا یاں جنگ سی جاری ہے
طاقت ہے یہاں زندہ اور موت ہے کمزوری
حیواں جو قوی تر ہیں کمزور کو کھاتے ہیں
ہم کارگہِ ہستی میں رسم یہ پاتے ہیں

اقبال کے فلسفۂ خودی کو استعاراتی اسلوب میں پیش کرنے کی یہ ایک نادر مثال ہے جو مولانا سراج الحق کے علوئے فکر کی محکم دلیل ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ علمائے کرام کا ایک بڑا طبقہ اقبال کے فکر و فلسفہ کا قدر دان تھا۔ مگر ایک حلقہ اقبال سے بوجوہ گریزاں بھی تھا خاص طور پر دیوبند سے وابستہ حضرات اقبال سے ایک فاصلہ رکھتے تھے۔ مولانا سراج الحق مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم سے بیعت تھے۔ مگر اس نسبت کے باوجود فکر و خیال میں وسیع النظر اور کشادہ دل تھے انھیں اقبال کے افکار سے ایک ذہنی و فکری اشتراک تھا۔ غالباً وہ پہلے عالم دین ہیں جس نے اقبال کے فلسفہ و فکر کی تائید و توسیع میں ایک سو چھبیس اشعار کی بیانیہ نظم تخلیق کی ہے نظم کے پہلے بند کے دو شعر ملاحظہ ہوں ۔

اقبال نے دکھلایا ہے ''نفیٔ خودی لعنت'' ان شیروں کی حالت سے یہ بات نمایاں ہے
رومی کے یہاں دیکھا اک قصہ میں یہ نکتہ احساسِ خودی ہونا معراج کا ساماں ہے

نظم کے آخر میں ایک فن کارانہ گریز بہت ہی پرکشش ہے۔

شیر نشۂ مستی میں نغمہ سرا ہوتا ہے۔ یہ نغمہ نہیں نظم عالم کا جاوداں ترانہ ہے۔ جسے اقبال نے نظم ''شاہین'' میں پیش کیا ہے

افلاک کی وسعت ہو ہم شیروں کے نعروں کو ہے تنگ بہت ہم پہ پہنائے بیابانہ

ہم شیر ہیں زندہ ہیں جرأت ہے کنیز اپنی　　بھیڑوں نے ہمیں شاید اب تک نہیں پہچانا ہے
ہم زور کے مالک ہیں ہم مکر کو کیا جانیں　　مکار کو آساں ہے ہم شیروں کو بہکانا
بہکیں گے دو دن کو، پھر شغل وہی ہوں گے
یا صیدِ ہزبرانہ یا جنگِ پلنگانہ

خانوادۂ مولانا سراج الحق کے چشم و چراغ مفتی سراج نے دوسری اشاعت کے حرفِ آغاز میں لکھا ہے:

''سراج المحققین حضرت مولانا محمد سراج الحق سراج مچھلی شہریؒ (سابق پروفیسر فارسی وعربی گورنمنٹ کالج الہ آباد) علامہ اقبال کے شیدائیوں میں تھے۔ اور ان کے دینی اور اسلامی شاعر ہونے کی حیثیت سے بڑے قائل ومعترف بھی۔''

اس نظم کے انتساب میں مولانا سراج الحق سراج نے لکھا ہے:

''اس ناچیز خدمت زبان کو میں صدف کائنات کے اس عزیز الوجود دردانہ اور مادر حقیقت کی اس اکلوتی دوشیزہ کے نام معنون کرتا ہوں جسے ''خودی'' معرفت نفس کہتے ہیں۔ اور جس کے جمال حیرت افروز کے نظارے کے لیے علامہ اقبال نے یہ آئینہ تیار کیا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

سراج مچھلی شہری

دیار شرق میں اقبال شناسی کے ابرِ نیساں کی گہر باری سے ذرۂ زمیں زرفشاں ہوا۔

عصری شاعری میں ایک انقلاب بردوش آواز احمد مجتبیٰ وامق جون پوری (۱۹۰۹۔۱۹۹۸) کی ہے۔ وہ ترقی پسند اور مصلحت نا آشنا لائقِ احترام عوامی مقبولیت کے حامل فن کار تھے۔ وہ مشتہری میں مصروف اور مغرور ترقی پسندوں سے مختلف تھے۔ انہوں نے خودنوشت گفتنی اور ناگفتنی میں نام نہاد ترقی یا انقلاب پسندوں سے ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ ترقی پسندی کے نام پر مفاد پرستی یا جاہ پرستی کے سایہ میں پرورش پانے والوں کا ایک قبیلہ تحریک کی پاسداری کا پرچم بلند کر رہا تھا۔ وامق نے ان کی سیادت وقیادت دونوں سے انحراف کیا اور اپنی راہ کو چراغِ رہ گزر بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دوسروں سے اس رہ گزر کی پیروی کی نہ آرزو کی نہ پرواہ اور نہ خود پرچم کشائی کا دعویٰ کیا۔ بقول اقبال خود ہمہ بے گانہ ومستانہ گامزن رہے۔ انہوں نے اقبال کے فکر وفلسفہ سے استفادے کا اقرار کیا اور نہ انکار۔ مگر لاشعور میں اقبال کی آواز آہنگ کی کارفرمائی موجِ تہ نشیں کی طرح جھلکتی ہے ۔ یہ سچ ہے کہ جو بھی انقلاب واحتجاج کی آواز بلند کرے گا یا بیداری وجاں سپاری کو لبیک کہے گا۔ اس کی لے اور لہجے میں فکرِ اقبال کی سرگوشیاں ضرور سنائی دیں گی ۔ وامق کے یہاں اقبال کا نام نہیں آیا مگر لفظ ومعنیٰ کے ارتباط میں اقبال کی سایہ نشینی محسوس کی جاسکتی ہے ۔ اقبال کی چند لفظیات بھی غمازی کرتی ہیں۔ جیسے فکر فردا، خوشۂ گندم، خزاں رسیدہ ، دانش افرنگ، تغیر، ارتقا وادیٔ لولاب، عروجِ آدم خاکی وغیرہ۔

اقبال کے کچھ پسندیدہ موضوعات بھی وامق کے کلام میں موجو ہیں۔ ان کے اشارات اقبال سے ہی منسوب کیے جاسکتے ہیں۔ جیسے

مگر اب دانشِ افرنگ کے فتووں کی قسم
انقلاب اور ادب ہائے غضب
کتنے مخدوش ہیں یہ سب آثار

ان کے افسانوں کا موضوع عجیب
کالی لڑکی ،کبھی کالی شلوار

یہ وامق کا عہدِ جدید کے فن کاروں کی گمراہ اور مسموم فکر پر شدید طنز ہے۔جس کی نسبت فکرِ اقبال سے قائم ہوتی ہے

ہند کے شاعر وصورت گروافسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

مزدور، کاشتکار، خوشۂ گندم ،کھیت ،خرمن ، برق ورعد کے تمام رشتے فکر اقبال سے ملتے ہیں ۔یہ ترکیب اور تحریک کے اشارے سے وامق کے یہاں عمومی نوعیت کے ہیں بلکہ انقلاب احتجاج کی علامت ہیں۔

یہ مزدوروں کا لشکر ہے کسانوں کی چڑھاتی ہے
ابھی تو کھیتوں میں چلتی ہے بھوک کی آندھی

اقبال نے کہا تھا

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہوروزی

اقبال کی بیداری کے خاص لہجے کو ملاحظہ کیجئے جو پہلی بار کثرت اور فکر کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔اٹھو کا لفظ اقبال کے یہاں بڑی معنویت کا حامل ہے۔

اٹھو اے جاں فروشو سر کٹانے کے لیے اٹھو

فکر اقبال کا ایک اساسی نکتہ ارتقائے تسلسل کا عمل ہے جو کائنات کے تکوینی نظام میں شامل ہے۔ان کا مشہور قول ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

وامق نے 'شب چراغ' میں اس فلسفۂ ارتقا کو بڑی معنویت دی ہے۔ اور ابنِ آدم کے وسیلے سے اسے مزاجِ کائنات گردانا ہے۔

تغیر اس کی عادت ارتقا اس کی شریعت ہے
عروجِ آدم خاکی تو اس مٹی کی فطرت ہے

فکر سے براہِ راست استفادے کی صورت نہ بھی ہو مگر عصری فکر پوری فضائے بسیط میں گردش کرتی ہے۔ ایک دور کا انسان دوسرے افکار سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ لاشعور میں دوسرے فکر خیال کا در آنا ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ جب حالات ایک جیسے ہوں تو انسان کے فکری تلاطم کا احوال بھی یکساں ہوتا ہے۔ ایک طرح کی سوچ بیدار ہوتی ہے اسے ہم نہ استفادہ کہہ سکتے ہیں نہ سرقہ وتوارد۔ اسے نظم عالم کا فیضان اور بشری فکر و احساس کا حرفِ راز سمجھ سکتے ہیں اس راز کو سینا وفارابی نہیں سمجھ سکتے۔ ایک اور زاویہ نگاہ سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ وامق کی شاعری میں اقبال کا براہ راست تذکرہ نہیں ہے۔ اور راقم نے بھی چند موجود علامتوں کی بنیاد پر دونوں کے ذہنی وفکری اشتراک پر گفتگو کی جسارت کی ہے۔ یہ راقم کے قیاسات ہیں۔ جو عموماً تنقید میں ذہنی مماثلتوں کے سلسلے میں رائج ہیں سلسلۂ فکر کی یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وامق نے اپنے ڈرائنگ روم میں اپنی بنائی ہوئی شاہین کی تصویر آویزاں کی تھی وہ خود مصور تھے اور اس فن سے انھیں بڑا شوق تھا۔ وہ اچھے خوش خط یا فن کارانہ کتابت بھی کرتے تھے۔ شاہین کے علاوہ ان کے ڈرائنگ روم میں نظیری نیشاپوری کا حسب ذیل شعر بھی وصلی کی صورت میں آویزاں تھا۔

گریز داز صفِ ماہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

ہمیں معلوم ہے کہ اقبال کو نظیری کا یہ شعر اتنا پسند تھا کہ وہ اس کے عوض ملکِ جم کو

قربان کرنے کو تیار تھے۔انہوں نے فارسی شاعری جاوید نامہ نوائے حلاج اور پیامِ مشرق کی غزل میں نظیری کے اس مصرع کو حوالے کے طور پر منظوم کیا ہے شعر بہت ہی انقلابی اور حکیمانہ فکر کا حامل ہے۔

بملک ِ جم ندہم مصرع نظیری را
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ مانیست

وامق کے بغیر جون پور کی انجمنِ ناز کا تذکرہ ناتمام رہتا ہے۔ان کی جرأت گفتار اور انقلاب پسندی کی ہمیشہ قدر کی جائے گی اس انقلاب پسندی کی ایک شان دار علم برداری جون پور ہی کے ایک نوجوان کا نوشتۂ تقدیر بنا جو ترقی پسند تحریک کے سالار کہلائے سجاد ظہیر جون پور کی خاک وخمیر سے اٹھے۔ان کے والد محترم جون پور سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آباد ہوئے تھے اس طرح ترقی پسندی کا خمیر بھی جون پور کی خاک کا پروردہ ہے۔طرفہ تماشا ہے کہ ترقی پسندی پر سب سے پہلا تنقیدی اور معرکۃ الاراء مضمون بھی جون پور کے مشہور ومحترم ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے قلم سے رقم ہوا۔یہ جون پور کا حیرت انگیز کارنامہ ہے یا مذاقِ سخن۔

اسی خاک سے ایک دوسرا خانوادہ زرتار بن کر ابھرا۔حافظ ابوالفیض اینق جون پور کے معزز اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے۔داغ کے شاگرد اور شہر میں نمایاں ادبی شخصیت رکھتے تھے۔مینائے حجاز اس کا مجموعۂ کلام ہے۔اینق جون پوری کا گھرانہ علم وادب کی پرورش وپرداخت میں یکتائے روزگار ہے۔شفیق جون پوری ان کے صاحب زادے ہیں جن کی تخلیقات سے ایک عالم واقف ہے۔حفیظ ووامق کے بعد ادبی منظر نامہ پر شفیق جون پوری صبح کے ستارے کی طرح روشن ہوئے درجنوں کتابیں تخلیق کیں اور شفقی شاگردوں کی صف بستہ جماعت وجود میں آئی۔سفینہ، فانوس، خرمن نے، شانہ، خرمنِ عشق

،طوبیٰ ،صبح شہادت ،روداد چمن وغیرہ ان کی تخلیقات ہیں۔انیق کے دوسرے بیٹے مولانا نظام الدین تھے۔وہ انیق کے علاوہ محوی صدیقی سے فیضیاب تھے۔جن کا دائرہ کار ادب کے علاوہ سیاست بھی تھا وہ حکمراں جماعت سے وابستہ تھے۔جن کی وجہ سے تخلیق وتنقید کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوسکے۔مگر ان کے برادر خورد عزیز ربّانی عزیز (۱۵۲۵۔۱۹۴۸) اپنے خانوادے کی ادبی آبرو کے محافظ بن کر ابھرے

عہدِ حاضر کو میں پُرنور بنادوں نہ اگر
تم مجھے آج سے کہنا نہ عزیز ابنِ انیق

وہ شعروادب کی طرف سنجیدگی سے متوجہ تھے۔اگر چہ سیاست میں بھی ان کی کارگہی قابلِ ذکر ہے۔فرنگی محل کے سند یافتہ تھے علومِ دینی کے ساتھ اردو شعروادب سے بھی بھرپور واقفیت حاصل کی تھی ،بردار بزرگ شفیق کی طرح علامہ اقبال کو قدر و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ان کے اشعار میں جابجا اقبال کا اعتراف ملتا ہے۔جس سے ان کے فکر و ذہن کے زاویہ ہائے نظر کا سراغ ملتا ہے اور شفیق کی روشن کی ہوئی رہ گزر کا سلسلہ استوار ہوتا ہے۔پورے یقین اور خوش بیانی کے ساتھ علامہ سے اپنی فکری وجذباتی نسبت کا اعلان کرتے ہیں۔

مے خانۂ اقبال کا مے نوش ہوں اے دوست
مجھ کو ادبِ نو سے کوئی کام نہیں ہے

ایک دوسرے مقام پر تکرار کے ساتھ علامہ اقبال کی قیادت وسیادت اور ان کی فکری رہ گزر کی پیروی وپاسانی کا اعلان کرتے ہیں۔

رہ برِ فکر ہیں میرے لیے اقبال وشفیق
میرے افکار ہیں عالی میری نظریں ہیں عمیق

ایک اور مصرع ملاحظہ ہو۔

یہاں اقبال سوتا ہے یہاں حسرت کو نیند آئی

عزیز کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ گویا ۲۳ سال کی عمر میں کلام کا منظر عام پر آنا ان کے عہدِ شباب کے پر جوش فکر و جذبے اور قادرالکلامی کی ترجمانی کرتا ہے۔ نوجوان شعرا کے اس تخلیقی رویے اور رجحان کا ایک سرچشمہ اقبال کی انقلابی فکر ہے جو جوانوں کی رگوں میں خونِ گرم بن کر گردش کرتا ہے۔ عزیز کے گھر میں اقبال روحِ روانِ لہو کی طرح موجود ہیں۔ عزیز کی شاعری اس دعوے کے لیے مستحکم بارِ ثبوت ہے۔

تدبر، رحمت اللعالمینی ، فتح وآزادی
انھیں چاروں عناصر سے مرکب میری فطرت ہے
منہدم ہوں قلعۂ باطل کی بنیادیں تمام
ایک ایسا نعرۂ قلبِ مسلماں چاہیے

عزیز کے مجاہدانہ خیالات قابلِ قدر و استحان ہیں۔ ان کی زندگی قلندرانہ گزری ۔کسبِ معاش اور کاسۂ زر سے بے نیاز رہے۔ صبر و قناعت کے ساتھ بلند اقدار کی نگہبانی زندگی کا منشور رہا۔ عزائم و استقلال کے اظہار و اشاعت پر مستقل مزاجی کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ ان کی تاکید و تنبیہ کی تلخی میں اخلاص و دردمندی نمایاں ہے۔

اے ہند کے ذلیل مسلمان غور کر
خود داریوں کا مرتبہ ہے کس قدر بلند
یہ بات ہے اخوتِ اسلام کے خلاف
ہواک سربلند ہزاروں نیاز مند

اقبال کی خودی، خودداری، خودشکنی و خودنگری کے گہر ہائے گراں مایہ ان اشعار

کے فلسفیانہ نکات ومباحث ہیں۔جن کے لیے عزیز ربانی یاد رہیں گے۔اب ذرا علامہ کے قوتِ عمل کے حکیمانہ نکات ملاحظہ ہوں۔

جس قوم میں عمل نہیں قربانیاں نہیں
کچھ اس پہ حُریت کی حقیقت عیاں نہیں
ذوقِ عرفاں چاہئے ، احساسِ ایماں چاہیے
انتم الاعلون کی شانِ نمایاں چاہئے

اقبال کی صرف لفظیات ہی نہیں بلکہ لفظوں میں پیوست افکار کا تلاطم اور اضطراب بھی عزیز کے فکروفن میں جاری ہے،عمل،حریت،ذوق،عرفاں،احساسِ ایماں، انتم الاعلون جیسی قرآنی آیت بھی اقبال سے ماخوذ ومستعار ہیں۔اقبال کی پیروی پر ناز کرنے کے اعلانیے کی یہ علامتیں فکرونظر کے بالیدہ شعور کا اشارہ کرتی ہیں۔ایک اور تلمیح ملاحظہ ہو۔

صورت ونام تو اب بھی ہے مسلماں کی طرح
کب ہے کردار مگر بوذرؓ وسلماںؓ کی طرح

عزیز ربانی کی ایک نظم ''نوائے من'' بڑی دل سوز وجاں گداز ہے۔فکر کا آہنگ عزم وجواں مردی سے لبریز ہے۔پیغام مجاہداتِ زندگی سے نبرآزمائی کو قانون فطرت کہتا ہے یہ دستور ومنشور اقبال وعزیز کو پسند خاطر ہی نہیں رہے ہر مردکار کا شیوۂ حیات بتاتے ہیں جس سے روگردانی ہلاکت ہے۔

نظم کے ذخیرۂ الفاظ اور ترکیبوں کی تہہ میں موجزن معنی کی کیفیات ملاحظہ ہوں:

میرا درس صداقت ذمہ دارِ امن وراحت ہے
اخوت ہے ،محبت ہے عدالت ہے شجاعت ہے

مجاہد ہوں مرے ہاتھوں میں دنیا کی قیادت ہے
مری ایک ایک انگڑائی پیام فتح ونصرت ہے
اگر نسل ووطن پر ہے بنائے فتح وآزادی
تو جمعیت بھی رخصت ہے تری وحدت بھی رخصت ہے

اقبال طاؤس ورباب کے برعکس شمشیر وسناں، جل ترنگ کی جگہ لہو ترنگ جوئے نغمہ خواں کے بدلے سیلِ تندرو بننے اور حاصل کرنے کا جذبہ بیدار کرتے ہیں۔ یہی ان کی فکری کارگہی کا حاصلِ حیات ہے۔ عزیز ربانی کو زندگی کے یہی معرکے عزیز تر ہیں۔

اب شیشہ وشراب نہ جامِ نظر ملے
اے میرے میکدہ مجھے تیغ وتبر ملے

اس پرشور آہنگ کا سلسلۂ ان کے ممدوح علامہ اقبال کے فکر ونظر سے ملتا ہے حرف آخر کے طور پر وہ فکر بھی پیش نگاہ رہے۔ جو علامہ کی فکر ونظر کا ماحصل یا محور اور اساسی نکتہ ہے۔ جس نکتے کی بنیاد پر فلسفہ وفکر کی دنیائے بے کراں میں اقبال کی وحدت وانفرادیت ممتاز اور منفرد مقام کی حامل ہے۔ عزیز ربانی کی زباں سے اس نکتہ کا حرفِ راز ملاحظہ ہو

اسلام جہانگیر ہے بن تو بھی جہانگیر
اے بندۂ مومن قفس ودام کہاں تک
خودی کی شان تھی زیر قدم زمانہ تھا
خودی کے مٹتے ہی بے نور آستانہ تھا

شعری اظہار اور فکری اقرار میں اقبال کے پرستاروں میں عزیز ربانی جیسے اہل قلم کم یاب ہیں۔ ان جیسا احترام وعقیدت بھی جنسِ نایاب ہے۔ ان کے دو شعری

مجموعے نظر سے گزرے 'جرس' اور 'نوائے صحرا' عزیز ربانی کے ایک معنی خیز اور معانی آفریں شعر میں جون پور کی حکایت دل نواز شان وشکوہ مرغ قبلہ نما کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ علم وفن کا گہوارہ ہے دانش گاہِ عالم میں
یہیں سے ظلمت آبادِ جہاں نے روشنی پائی

اس شہر نگاراں کے ایک محترم شاعر شوکت پردیسی (۱۹۲۴۔۱۹۹۵) کا نام قابلِ ذکر ہیں۔ وہ شفیق وعزیز کے معاصر ہی نہیں ہم نشیں بھی ہیں۔ ان احباب سے جون پور کے شعروادب کی محفلیں آباد اور سرگرم تخلیق تھیں۔ شوکت کا گھر تو مرکزِ التفات بھی تھا۔ ان کے دو شعری مجموعے ان کے صاحب زادے ندیم احمد نے بڑے اہتمام سے شائع کیے ہیں۔ شوکت پردیسی عوامی لب ولہجے اور عمومی موضوعات کے قلم کار ہیں۔ شخصیت کی سادگی نے زبان وبیان اور اسالیب میں بھی سادگی کی شان پیدا کی ہے۔ وہ گوشہ گیر اور کم نام شاعر رہے۔ پرفریب دنیائے فلم سازی سے بھی وابستہ ہوئے۔ یہاں کی زرق وبرق شہری آب وہوا بھی راس نہ آئی۔ آبرومندی کے ساتھ پرورشِ لوح وقلم کرتے رہے۔ مزاج کی انکساری نے قناعت وقلندری سے قربت پیدا کی۔ پرشور اور پُر آشوب لہجے سے وہ باز رہے۔ اس لیے بھی وہ اقبال کے شعری شکوہ وجلال سے قدرے دور رہے۔ مگر خیال وافکار میں اپنی بساط کے مطابق اقبال کے فکر وپیغام کے ہم نوا رہے، ایک جگہ یہ اعتراف قابلِ غور ہے کہ اقبال کی زمین ہے حسرت بھی سو رہے ہیں۔ دونوں کی انقلابی فکر اور کفن بردوش زندگی کا یہ فکر انگیز اشارہ ہے۔ ایک دوسری جگہ خراج عقیدت کے طور پر تذکرہ ہے۔

اس میں اقبال وٹیگور واکبر ہوے

انہوں نے ماڈرن شکوہ کے نام پر نظم قلم بند کی ہے۔ شعری مجموعہ ''مضراب سخن'' میں ''عزم'' کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں بیداری کا پیغام اور کچھ کر گزرنے کی

دعوت دی گئی ہے۔نظم کا انداز ملاحظہ ہو

اٹھو کسانو، اٹھو جوانو، اٹھو مقدر کے نوحہ خوانو
اٹھو خود اپنے عمل سے اپنی حیات کو کامراں بنادو

بیداری اور ہوشیاری میں تاکیدی لفظ کی تمام نسبتیں اقبال کی یاد دلاتی ہیں۔ اقبال نے جس کثرت سے اپنے کلام میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔وہ دوسری جگہ نظر نہیں آتا بلکہ یہ اقبال کی روایت بن گئی۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو
اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
اٹھا ساقیا پردہ اس رازے
اٹھاکر پھینک دو باہر گلی میں

اقبال کلام میں تقریباً انیس اشعار اسی لفظ سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ اقبال کا منفرد ومخصوص اور پسندیدہ اسلوب ہے۔جو ہماری شاعری میں احتجاجی لہجے کی روایت کا شناختی نشان بن گیا ہے۔شوکت پردیسی بھی اس روایت پر نرم روی کے ساتھ گامزن ہیں۔

مچھلی شہر اقبال شناسی کی رہ گزر کا ایک ممتاز سنگ نشاں رہا ہے یہاں اقبال کے استاد داغ دہلوی کے شاگردوں کی کہکشاں آباد تھی ۔اس سے قبل غالب کے شاگرد عبدالرزاق شاکر مچھلی شہری کی ممتاز ادبی شخصیت تھی۔اس سے قبل فتاویٰ عالمگیری

کے مرتب نے ذرۂ زمین کو رشکِ آسماں بنایا تھا، نزہت الخواطر میں مچھلی شہر کے متعدد علماء کا تذکرہ محفوظ ہے۔ میری نظر میں چند محترم شخصیتیں ہیں جو اقبال کے ہم نوا تھے۔ عبداللہ جعفری، رحمت اللہ قریشی حافظ سراج الدین کاشف (۱۹۳۱۔۱۹۵۵ء) وغیرہ۔ آخرالذکر تو پرستار اقبال تھے۔ ذوق وشوق کے ساتھ ان کے جذبہ ہائے بلند بھی حیرت فروش تھے، افسوس کہ ان کا کلام مرتب نہ ہوسکا اور نہ محفوظ رہ سکا۔ وہ خود بے نیاز اور شہرت واشاعت سے بے گانہ مردقلندر تھے۔ ملازمت کی وجہ سے قیام جون پور میں تھا۔ مگر ہر جمعہ کو مچھلی شہر جاتے اور خطیبِ شہر کی ذمہ داری ادا کرتے۔ وہ چاروں بھائیوں میں منفرد مزاج کے حامل تھے۔ سفر حضر میں ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی۔ حلقۂ دریشاں میں نئی کتاب کو متعارف کراتے اور اپنے تاثرات بیان کرتے حافظ سراج الدین کاشف مچھلی شہر کے ایک معروف فن کار تھے۔ وہ اقبال کے فکر وشعر کے سراپا ترجمان اور شاہ راہ اقبال کے ایک اعجاز بیان رہ روانِ شوق تھے وہ تفکیر دینی کے پیکر جمال بھی تھے۔ شیروانی ٹوپی اور چوڑی مہری کے پاجامے میں ملبوس نا آشائے سکون مرد مجاہد تھے۔ وہ پاکیزہ احساس اور پرخلوص جذبے سے ہمیشہ سرشار رہتے۔ محترم قدروں کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرتے بلکہ مسکراتے ہوئے پرزور لفظوں میں مکروہات کو مسترد کرتے۔ وہ دینی معاملات میں سخت گیر تھے مگر کشادہ دل اور وسیع النظر تھے وہ خوش مزاج اور دل نواز بھی تھے۔ نرم خو اور گرم جو تھے۔ علمی مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ معاملہ فہمی کا انھیں ادراک تھا وہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے کوشاں رہتے۔ مطالعہ سے ہی سروکار رہتا۔ حیرت کی بات ہے کہ کسی دینی مدرسے سے فارغ نہ ہونے کے باوجود علوم دینی پر نظر تھی۔ قرآن فہمی میں انھیں بڑا ادارک حاصل تھا۔ شہر کا ہر چھوٹا بڑا ان کا دل سے احترام کرتا۔ وہ پاک دل وپاک باز تھے فکر وخیال اور کردار وعمل میں بڑی شفافیت تھی۔ سرکاری ملازم تھے

۔وقت کی پابندی کا ہر لمحہ خیال رکھتے وہ مچھلی شہر کی مسجدِ جامع کے خطیب تھے فرائض کو انجام دیتے خطابت میں جلال اور شکوہ بیان کا غلبہ ہوتا بیداری واصلاح کا پیغام حاوی ہوتا۔عزم واستقلال کا پیام اور زندگی کی کشاکشوں سے نبرد آزما رہنے کی تلقین خاص موضوع ہوتا وہ دعوت وعزیمت کے پُر جوش پیکر تھے۔نسلِ نو کی تربیت اور نگہبانی پر خاص زور دیتے ۔بے حد حساس اور جذبے سے سرشار رہتے ۔واقعات سے بہت جلد متاثر ہوتے ۔ان کی شاعری کا یہی سب سے بڑا سبب ہوتا۔وہ راقم کے مڈل اسکول کے استاد مولوی عبدالرحیم مرحوم کے بڑے بیٹے تھے۔ان کے تین اور بھائی تھے۔مولوی عبدالرحیم مرحوم بھی شاعری کرتے تھے۔واصف ان کا تخلص تھا۔ان سے کبھی شعر سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔سنا ہے کہ وہ تحت میں پڑھتے ۔ان کی آواز میں بڑی کھنک تھی ۔حافظ سراج الدین کاشف بھی تحت میں پڑھتے ۔پڑھنے کا اسلوب دلکش تھا۔اقبال کے اسلوب وآہنگ کی ایسی پیروی کم دیکھی ۔جذبہ وفکر اور تحریر وتقریر کے آہنگ میں اقبال کی بازگشت ہم دوش اظہار بن کر نمایاں ہوتی ۔ان کی نظموں پر کبھی کبھی اقبال کا گمان غالب ہوتا ہے۔لفظیات اور تراکیب پر بھی محسوس ہوتا ہے کہ علامہ سے مستعار ہیں۔گو ایسا نہیں ہے کلام اقبال کے مطالعہ اور ذہنی مطابقت کے یہ بڑے حسین اور دلچسپ گہرے مؤثرات ہیں،ایک نظم کے پہلے بند کے اشعار ملاحظہ ہوں ان کے شکوہِ بیان اور عظمت وجلال سے معمور اسلوب کو دیکھے اور مسجد قرطبہ کے دوسرے قدرتِ کلام کی ہیبت طاری ہوتی ہے۔بند کا متن پیشِ نظر رکھیے۔

''فتح افغان''

(۱۹۹۲ء)

افغان مجاہدین سے خطاب

عشق کا تار نفس، نغمہ گر کائنات　　عشق طرف زار شوق ،عشق طلبگار ذات
عشق ہے حق الیقیں، پردہ کشائے صفات　　عشق نگارندۂ نقش گہ صد حیات
عشق دل افروز ہے ،عشق جہانسوز ہے　　عشق ہے اک انقلاب ،شعلہ زن ممکنات
عشق وفا کوش ہے،غم سے ہم آغوش ہے　　عشق صراط یقیں ،عشق ہے راہ نجات
عشق شہادتگہ فوز وفلاح ویقیں　　ملت بیضا مگر ، ہے ہدِ سومنات
عشق ہے سرمایۂ راہِ وفا وصفا　　خیرگی افزا ہو لاکھ جلوۂ لات ومنات
عشق ہے زادالسبیل ،عشق مرادِ خلیل　　عشق نوید مسیح، عشق ہے تنویر ذات
عشق ہدایت کی راہ ،عشق دم لاالہ　　عشق امیر سپاہ ،عشق ہے عزم وثبات
عشق ہے روح امم ،عشق ہے خیراتم　　عشق کرم ہی کرم ،عشق ہے رحمت صفات
عشق کی ممنون ہے ،گردش لیل ونہار　　عشق شناسائے کہف، جلوۂ حسن ممات
عشق ہے جہدوعمل ،عشق ہے نخل امل　　عشق عَسل ہی عسل ،عشق ہے شاخ نبات
عشق ہے یوسفؑ نظیر ،عشق زلیخا اسیر　　عشق بشیر ونذیر ،عشق شہ شش جہات
دارورسن کوبھی توعشق سے عظمت ملی　　عشق ہے فردوس وش ہوگئی نار حیات

عشق ہے صبح ازل،عشق ہے شام ابد
عشق ہے لاانتہا،عشق ہے بے حصر وحد

مچھلی شہر کی زمین ہمیشہ زرخیز رہی ہے۔ بزرگوں سے لے کر معاصرین تک دانۂ تسبیح کی مانند اقبال کے داناؤں کا ایک شجرہ ہے جس میں تسلسل اور تحریک کی کارکردگی منقطع نہیں ہوتی اور نہ وقفہ حائل ہوتا ہے۔ مچھلی شہر کی خاکِ ارجمند سے نشو ونما پانے والے ایک لایق احترام شخصیت پروفیسر سید مجاور حسین رضوی کی ہے۔ بقول ان کے ان کی صحیح تاریخِ پیدائش ۱۹۲۸ء ہے۔ اور سرکاری ۱۹۳۲ء درج ہے۔ وہ ایک محبت بھری شخصیت اور حسنِ سلوک کے پیکر ہیں۔ وہ منبر ومسلک ہو یا منصبِ دار پر منصفی اور معتدل

مزاجی کی مثال نظر آتے ہیں۔

فضلِ ربی ہے کہ وہ اس وقت پچانوے سال کے ہیں۔ اور حافظہ قابلِ رشک ہے۔ ۱۰؍دسمبر کی دوپہر میں فون پر ان سے طویل گفتگو ہوئی۔ کہنے لگے کہ ''میں اقبال شناس ہی نہیں میرے رگ وریشے میں اقبال سمایا ہوا ہے۔ کہو تو میں اقبال کے پانچ سو اشعار سنادوں۔'' انہوں نے بالِ جبریل کی سولہویں غزل کے آخر کے آٹھ اشعار

درویش خدا مست شرقی ہے نہ غربی

سے لے کر مقطع کا آخری مصرع

کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

ترتیب کے ساتھ اور بغیر رکے ہو سنائے۔ ناچیز حیرت زدہ ہو کر سنتا رہا۔ یہ خوبی اقبال شناسوں میں بہت کم دیکھی اس طویل عمر تک رسائی اور یادداشت کا یہ عالم نعمتِ خداوندی ہے۔ جو شاید ہی کسی اردو استاد کو نصیب ہوتی ہو۔ ایمان ویقین پر استقلال کے ساتھ اقبال سے پُرخلوص محبت بھی گوہر کم یاب ہے۔ گو انہوں نے اقبال پر کتاب نہیں لکھی۔ مگر ان کے مضامین کا اجمال اقبال نما قلندر کے کشکول سے کم نہیں ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالے ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی'' میں اقبال کے تصورات کا تجزیہ اقبالیاتی ذکر وفکر کا آئینہ جہاں نما ہے۔ پروفیسر موصوف کے خیال افروز مضامین کا مجموعہ ''جہانِ افکار'' ۱۹۸۸ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں اقبال پر پانچ فکر انگیز مقالات موجود ہیں۔ اقبال اور شعری خطابت، اقبال کا تصورِ سجدہ، نظریہ اور نظریہ سازی، نگاہ ایک جہانِ معنٰی اقبال اور قومی یک جہتی آخری مضمون ہے اور پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات اقبال شناسی کے ذخیرہ میں شب چراغ اور قندیل کی روشنی کے مانند ہیں۔ ان میں نئے نکات اور مباحث زیرِغور ہیں۔ ان سے پروفیسر موصوف کی اقبال بینی اور شعر

اقبال کے جمال کی ہم نشینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے مذاکرے میں ایک فکر انگیز مقالہ ''اقبال کا تصور سجدہ'' پیش کیا تھا۔ وہ مضمون ندرتِ خیال کے ساتھ ایک نئے عنوان کے اشارات پر قابلِ توجہ مقالہ ہے۔ پروفیسر مجاور حسین نے کئی شاگردوں سے علامہ کے مختلف موضوعات پر ایم۔فل کے مقالات بھی قلم بند کرائے تھے۔ اس تذکرے سے ان کی اقبال شناسی اور ذہنی قربتوں کا علم ہوتا ہے۔ مچھلی شہر کے اساتذہ اور اہل علم نے علامہ کے شعر و پیغام کی ترویج و اشاعت کی رہ گزر میں غبار کارواں کے ساتھ سنگِ نشاں بن کر ہم دوشِ سفر ہوئے ہیں۔ اس کی نمایاں نظر پروفیسر سید مجاور حسین رضوی ہیں۔

عمرِ تو ہزار سال بادا

پروفیسر موصوف کے فکر افروز خیالات کو جاننے کے لیے اس اقتباس کو ملاحظہ کیجئے۔ جو نظریہ اور نظریہ سازی سے ماخوذ ہے۔

''اقبال دنیائے فکر کا وہ واحد مفکر اور نظریہ ساز ہے جو ذات سے صفات کو الگ نہیں سمجھتا۔ ذات سے صفات اس طرح پیدا ہوتی ہیں جیسے گلاب سے خوشبو۔ اس کے یہاں ذات وقت کے دھارے ہیں گم نہیں وہ تو وقت کو بھی زمان و مکاں کو بھی طلسم سمجھتا ہے اس کے یہاں عشق اظہارِ ذات ہے۔ عشق کی تصویر میں عصرِ رواں کے سوا اور بھی بے نام زمانے ملتے ہیں۔ دوسروں کے یہاں زمانے کی رویں نہ دن ہے نہ رات۔ ہر شے سلسلۂ روز و شب کی پابند ہے۔ مگر انسان آئینہ ایام میں اپنی دیکھنے والا انسان ستاروں سے آگے جہانِ نو کی تلاش کرتا ہے۔ وہ دنیا کے سب سے باشرف انسان کی ذات دیکھ کر یہ پکار اٹھتا ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

جہانِ افکار ص۔۱۰۸

اس اقتباس کے مطالعہ سے پروفیسر مجاور حسین کے خیالات اور ذکر وفکر کے مثبت اور مطہر رویوں کا اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھا۔ پروفیسر احتشام حسین بوجوہ اقبال کے پرستاروں میں نہ تھے۔ بلکہ انہوں نے تنقید اور کم نگہی کا ثبوت دیا ہے جب کہ ان کے شاگرد عزیز نے اعتراف واعتدال کی مثال قائم کی ہے۔ایک خاص عقیدے پر احترام کے ساتھ قائم پروفیسر سید مجاور حسین رضوی اقبال شناسی میں بہت ہی محترم ،معتبر ومعتدل نقاد اور دانشور ہیں۔ان کی فہم وفراست اور فرزانگی کو راقم سلام پیش کرتا ہے مچھلی شہر کی سرزمین کے زربکف ہونے کی مثال ہے۔ان کے یہ پانچ مقالے ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو سید مجاور حسین رضوی کے گہربار قلم سے رقم ہوئے ہیں۔

درساغرِ من بادۂ شیراز ست

مچھلی شہر کے لایق صد احترام معاشیات کے ماہر اور عالمی آبادکاری کے علم (Demography) پر تحقیقی نظر رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر منیر عالم فریدی کو مطالعۂ اقبال سے خاصا شغف تھا۔ وہ مچھلی شہر کے جنوب تقریباً آٹھ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع موضع براواں کے باشندے تھے۔ان کا گھرانہ علمی وجاہت کے لیے مشہور ہے۔ان کے دوسرے چچا زاد بھائی ڈاکٹر توقیر عالم جامعہ میں معاشیات کے پروفیسر ہیں۔ وہ دہلی یونیورسٹی کے سب سے مشہور ادارے دلی اسکول آف اکنامکس کے انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک گروتھ (Institute of Economic Growth) میں پروفیسر تھے۔ علم معاشیات سے سروکار تھا۔مگر اقبال اور مطالعہ اقبال ان کا محبوب اور دل پسند موضوع تھا۔علامہ کی کتاب علم الاقتصاد پر ان کی خاص توجہ تھی وہ اقبال اکیڈمی کے مذاکروں میں

شریک ہوتے اور اظہارِ خیال کرتے انہوں نے اقبال کے معاشی تصورات پر مضمون قلم بند کیا جو 'میرا پیام' میں شائع ہوا۔ ناگہانی رحلت کی وجہ سے ان کیے دوسرے مضامین شائع نہ ہو سکے وہ عصری پس منظر میں علم الاقتصاد کے مباحث پر کتاب رقم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جون پور میں اقبال شناسی کی شاہراہ کے ایک چراغ رہ گزر پروفیسر سید غلام سمنانی بھی ہیں۔ جون پور کی زمیں سے ایسے گل ہائے زربکف کم پیدا ہوئے۔ جامعیت سے بھرپور ایسی شخصیت بھی کم دیکھنے کو ملی وہ یکتائے روزگار عالم ادب اور دیدہ ور فن کار تھے۔ مگر بقول اقبال ان کی خودی ان پر آشکار نہ تھی۔ کیوں کہ ان کو اپنے وجود میں شامل ربِّ جلیل کی بخشی ہوئی نعمتوں کا ادراک نہ تھا وہ دو زبانوں یعنی اردو اور انگریزی ادب کے ماہر ،مترجم ناقد، استاد شاعر اور ایک مثالی انسان تھے بہت کم لکھا جو لکھا اسے بھی سنبھالنا نہ آیا اشاعت واشتہار کی پرواہ نہ کی خیر سے دو ایک چیزیں شائع ہوگئیں وہ بھی حسنِ اتفاق سے یا دوسروں کے اصرار سے۔ منصوبے بناتے پھر عذر معشوقانہ بھی پیش کر دیتے۔ اس تساہل سے علم وادب کا نقصان ہوا۔

سید غلام سمنانی مرحوم (وفات ۲۲/اپریل ۱۹۹۹ء) سے دہلی میں ملاقات ہوئی وہ مجھے بہت عزیز لگے۔ پہلی ملاقات میں ان کی پُر وقار علمی شخصیت نے متاثر کیا۔ وہ انگریزی کے استاد تھے۔ مگر اردو، فارسی، اسلامیات اور شعر کے تخلیقی نکات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ناچیز کو جون پور کی دو بڑی شخصیتوں کی علمی عظمت اور وجاہت نے علاقائی عصبیت کے فخر بے جا کی نفسیات سے قریب تر کیا۔ اب سوچتا ہوں تو میرا احساسِ تفاخر غلط بھی نہ تھا۔ خاکسار نے سید غلام سمنانی جیسے وسیع اور جامع مطالعہ سے مربوط شخصیت کم دیکھے۔ وہ برادرانہ شفقت فرماتے۔ ناچیز ان سے اصرار بھی کرتا کہ وہ تصنیف وتالیف کی

طرف متوجہ ہوں۔مگر پان کی گلوریاں اور شعراء کی ہم نشینی ان کے لیے حصار بن گئی تھیں وہ ہمہ وقت اس ہجوم ناز میں میر مجلس نظر آتے۔گھنٹوں ہوسٹل کے تنگ کمرے میں اہل سخن باادب بیٹھے رہتے۔ان سے فرصت ملتی تو جسِ دم کے دوامی آزار کو انگیز کرنے کے لیے مجبور ہوتے۔ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے باوجود کچھ کام کر سکے۔نیشنل بک ٹرسٹ کی فرمائش پر امیر خسرو پر انگریزی میں ایک مونوگراف تیار کیا۔عہد شاہ جہاں کی ایک تاریخ کا ترجمہ کیا۔باشم کی مشہور تاریخی کتاب ''ہندوستان کا شاندار ماضی'' کا ترجمہ شائع کیا۔یہ ان کی علمی اور ذولسانی بصیرت کا بہترین شاہ کار ہے اس ترجمے نے علمی وقار میں اضافہ کیا۔ترجمے کو تخلیق کا حریف بنادیا۔علامہ اقبال سے ان کی عقیدت مندی اور پرستاری لائق ستائش تھی۔اقبال کی مجلس شوریٰ کی پیروی میں کیفی اعظمی، پروفیسر محمد حسن کے بعد انہوں نے چوتھی مجلس شوریٰ تخلیق کی جو فکرِ اقبال سے ہم آہنگ ہے اور شعری حسن آفرینی سے دہلی کی کئی محفلوں میں شعر سناتے ہوئے دیکھا اور اکثر روبرو بھی سنا۔شاعری فارسی ترکیبوں سے گراں قدر تھی،مگر بوجھل نہیں محسوس ہوئی۔کیوں کہ کئی ماہ تک سردیوں میں انہوں نے راقم کے غریب خانے پر قیام کیا۔کالج سے دور قیام تھا اور بچے جون پور جا چکے تھے مجھے دہلی یونیورسٹی احاطہ میں یونی ورسٹی کا مکان ملا ہوا تھا۔میری گذارش پر وہ میرے پاس آ گئے۔میرا بھانجہ ہر وقت ان کی خدمت کرتا۔چند ماہ ان کے ساتھ بہت اچھے گزرے۔سردیوں میں بھی وہ آدھی رات تک نیند کو ٹالتے رہتے۔ان کی صبح بھی دیر سے نمودار ہوتی۔اٹھنے کے بعد نماز ادا کرتے۔فیضان (میرا بھانجہ) مصلے پر ہی انھیں چائے پیش کرتا۔ان سے دعائیں لیتا۔چونکہ وہ ذاکر حسین کے شبینہ کالج میں تھے اس لیے بہت اطمینان سے سہ پہر میں کالج کے لیے کشاں کشاں روانہ ہوتے۔تدریسی اوقات کے بعد اکثر محفل شعر بھی منعقد ہو جاتی۔دن بھر کی تکان سے آسودگی مل جاتی۔تقریباً یہ

معمول بن گیا تھا۔

تیرے فسانے عجیب تیرے زمانے عجیب

۱۳۰ اشعار پر مشتمل ہے ابلیس کی تیری مجلسِ شوریٰ یہ نظم سمنانی مرحوم کے قدرت کلام کی یادگار رہے۔ ابلیس کی آخری گفتگو کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

میں کہ ہوں آتش نفس ، آتش نژاد ، آتش ضمیر
میری قسمت میں نہیں فیضِ نجات ِ اخروی
ہے مرا پرداختہ اس دور کا سارا نظام
ہے مری پروردۂ آغوش ِ تہذیب نوی
اشتراکیت ہوئی میرے نفس سے بار ور
میرے ہی زلّہ ربا ہیں مزد کی ومانوی

سمنانی مرحوم نے نظم میں ایک دوسرا نکتہ پیدا کیا ہے کہ ابلیس کی زبان سے شاعرِ مشرق کے حضور خراج پیش کرنے کا منتظر بھی منظوم کیا ہے۔

وہ حکیمِ ارضِ مشرق نغمہ سازِ بے بدل
سرگروہِ عاشقاں ، سرخیل ارباب ہمم
صاحبِ ضربِ کلیم وجانِ اسرارورموز
دیکھتا ہے دل کے آئینہ میں تقدیرِ امم

لفظیات اور آہنگ کے ساتھ اقبال کے تعارف کا اسلوب بھی انوکھا ہے۔ مرحوم کی پوری شاعری پر اقبال کی فکر اور اسالیب کا گہرا نقش نمایاں ہے۔ شخصیت کے ساتھ حلقۂ یاراں میں ایسے مرد ہنر مند کا کلام مرتب نہ ہوسکا۔ ان کی شعری تخلیق کی یہ شناخت بھی تھی۔ افسوس ہے کہ ایسے مردِ ہنر کا کلام مرتب نہ ہوسکا۔ ان کی غزلیں بھی ان کے منفرد اسلوب

فکر کی غماز ہیں وہ کلاسیکی روایات کی حامل ہیں۔اور جدید فکر و مسائل کی ترجمانی سے معمور بھی ہیں۔

مسجد قرطبہ کے واگذاشت ہونے کی خبر پر سمنانی صاحب نے اسی وزن اور ہیئت میں ۶۸ اشعار کی بڑی خوب صورت نظم لکھی۔جو رسالہ 'معارف' میں بڑے اہتمام سے شائع ہوئی۔یہ ایک مرصع اور مربوط آہنگ سے منفرد اسلوب کی حامل ہے اور اقبال کی تخلیق سے قریب تر ہے۔اس نظم سے مشابہ ابھی تک کوئی دوسری نظم نظر سے نہیں گزری اقبال کے 'پیامِ مشرق' کے ''لالۂ طور'' کی رباعیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔مسودہ مجھے دکھایا تھا اور کچھ حصہ سنایا بھی تھا۔افسوس ہے کہ انتقال کے بعد ان رباعیوں کا کیا انجام ہوا۔معلوم نہ ہوسکا،مرحوم کی بہت سی تحریریں اسی طرح تلف ہوئیں۔مرحوم مزاجاً قلندری اور بے نیازی کے پیکر تھے وہ اپنا نہ بن سکے اور نہ اپنا کچھ کرسکے ہاں تن آسانوں کے کام آئے۔وہ مردِ میداں اور میر لشکر کی آرزو بھی نہیں رکھتے تھے۔ہاں سجادہ نشینی کی مجلسی روایت پر ہمیشہ کاربند رہے مگر شاعری میں عزم جواں اور پیکارِ زندگی کی ترجمانی ان کا شیوۂ گفتار تھا۔وہ مردِ میداں نہ تھے۔نہ مرد سپاہی خلوتیوں کے کدو پر قناعت کرتے۔مگر گرمیٔ قلم میں شیوۂ سرافیل کی بانگِ اذاں اور آوازِ رحیلِ کارواں رقم کرتے رہے۔سکون پسند زندگی تھی۔علم کا جلال پُر شکوہ تھا۔مگر نرم دمِ گفتار تھے۔تبحر علمی کے ساتھ وہ مسلکی معاملات میں محدود نظر رکھتے تھے۔چوں کہ وہ خانوادۂ خانقاہی کے پروردہ تھے۔ان کے عزیز و اقارب کو بھی کچھو چھہ کی سجادگی و شہ نشینی راس آتی تھی۔سمنانی مرحوم بھی اسے حصارِ دیں سمجھ کر داخل رہے۔مگر تشدد و تمکنت سے عار تھا۔

لطائفِ اشرفیہ مخطوطہ کی تدوین و ترجمہ کا بار بار ذکر کرتے۔نعتیہ ادب سے فکری مناسبت تھی۔اس موضوع پر ان کی گفتگو وسعتِ مطالعہ کی مظہر ہوتی۔مولانا سہیل اعظمی کا

بےنظیر نعتیہ قصیدہ:

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعیِ امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی

پورا قصیدہ تقریباً ازبر تھا وہ لطف وانبساط کے ساتھ اکثر پڑھتے۔ اقبال کا کلام ان کے ریشہ ہائے دل میں رواں رہتا۔ خود ان کی شاعری میں اقبال کی لفظیات اور ترکیبیں ان کی شناخت بن گئی تھیں معاصر شعراء کی محفلوں میں ان کا بڑا وقار تھا۔ ان جیسا کوئی صاحبِ مطالعہ بھی نہ تھا۔ مگر خاکساری اور عاجزی ان کی نسبی فطرت کا جوہر خاص تھا۔ جس میں تکبر اور تمکنت کا شائبہ بھی مفقود تھا۔ انہوں نے کئی کتابوں پر مقدمے لکھے اور قطعات تاریخ بھی رقم کیں جون پور کے ایک کہنہ مشق شاعر محسن رضا کے شعری مجموعہ 'زخمہ' کا مقدمہ قابلِ ذکر ہے ان کے انتقال پر تاریخ بھی قلم بند کی۔ دہلی یونیورسٹی کے قریب اسپتال میں انتقال کی خبر ملی۔ سایۂ شفقت سے محرومی اور چراغِ علم کا سرِ شام بجھ جانا، راقم کے قیامِ دہلی کا پہلا حادثہ تھا۔ دہلی میں کسی دوست کے گزر جانے کا یہ پہلا صدمہ تھا۔ بعد میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور پروفیسر محمد حسن جیسے محسن ومربی کے انتقال سے شہرِ علم پر تاریکی ویرانی کا احساس ہوا۔

پاس اگر تو نہیں شہر ہے ویراں تمام

ان حضرات کی رفاقتیں اور بے شمار یادیں اب بھی گوشۂ دل میں اضطراب پیدا کرتی ہیں۔ دیر تک سکوتِ مرگ کی خاموشی طاری رہتی ہے۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

نظم 'مسجدِ قرطبہ' کے آخری بند کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرحلۂ حق میں تھا صبر ورضا کا سبب جس سے ہوا آشکار، ترویح وخلیلؑ

اسکا عمل اسکا عزم، اس کا حشم اس کا حزم　　چشم جہاں کے لیے ایک کتاب الدلیل
جس کی زرہ لاالٰہ، جس کی پنہ لاالٰہ　　جس کے لیے کچھ نہیں تیغ وسناں اسپ وفیل
عرصۂ پیکار میں قلزم ذخار میں　　کچھ نہ رہا کیف وکم، کچھ نہ رہا قال وقیل
بن گیا مضراب جاں بنگیا مہمیز شوق　　اس کے قلیم کا صریر، اس کے فرس کا جمیل
بندۂ مومن کی روح تجھ سے ہے پرتوفشاں　　وہ بھی نہیں مستجیل تو بھی نہیں مستجیل
پھر ہے وہی رستخیر، پھر وہی شور ستیز　　تازہ نہ ہوجائے پھر قصۂ فرعون ونیل

پروفیسر سید غلام سمنانی نے اقبال کی کئی فارسی غزلوں کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ تراجم ان کے بکھرے علمی اساسے میں محفوظ ہیں۔ جو محترم ندیم علوی کے مخلصانہ تعاون سے راقم کو حاصل ہوئے ہیں۔ ان تمام ترجموں کا اس مضمون میں شامل کرنا مناسب نہیں ہے پھر بھی تبریک کے طور پر ایک غزل کو نقل کیا جا رہا ہے۔ یہ زبورِ عجم کی بڑی مترنم غزل ہے۔ فارسی غزل کا مطلع ہے

ایں ہم جہانے آن ہم جہانے　　ایں بیکرانے آں بیکرانے

سید غلام سمنانی مرحوم کا ترجمہ۔ ملاحظہ

یہ بھی جہاں ہے، وہ بھی جہاں ہے　　یہ بیکراں ہے، وہ بیکراں ہے
یہ ایک توہم، وہ اک گماں ہے　　شعلہ کا میرے ہراک دھواں ہے
یہ ایک لحظہ وہ ایک لمحہ　　ہے ذات میری جو جاوداں ہے
کیا اس کی قیمت، کیا، اس کی قیمت　　میں جان ہوں، جان نقد رواں ہے
دونوں اسیر دام مکاں ہیں　　یاں بھی زماں ہے، واں بھی مکاں ہے
یاں کام برا واں کام مرا　　آہ وفغاں ہے، آہ وفغاں ہے
یہ میرا رہزن، وہ میرا رہزن　　یاں بھی زیاں ہے، واں بھی زیاں ہے

اس کو جلا دوں، اس کو جلا دوں

یہ آشیاں ہے، وہ آشیاں ہے

اقبال کے شیدائیوں میں محمد کامل انصاری بی۔اے کا شمار ہوتا ہے۔جون پور کے مشہور محلّہ ملاٹولا کے رہنے والے تھے۔وہ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔الہ آباد یونی ورسٹی سے بی۔اے کیا تھا۔ان کے والد منشی عبدالحمید انصاری کا تب جون پوری ایک باذوق انسان تھے۔ان کا ایک پریس تھا یہاں سے متعدد کتابیں شائع ہوئیں وہ برق نام سے ایک ماہ نامہ رسالہ بھی اسی پریس سے شائع کرتے تھے ان کے گھر پر ادیبوں شاعروں کی خاصی آمد رہتی۔کامل کو اس ماحل سے بڑی تقویت ملی۔قدرت نے شعر کہنے کی صلاحیت سے نوازا تھا۔ان کی تقریباً دس کتابیں ہیں ایک مختصر کتاب ہماری صحافت کے نام سے مشہور ہوئی۔۱۹۴۰ء میں انھیں کے پریس سے یہ کتاب شائع ہوئی۔اگر یہ کہا جائے کہ اردو فن صحافت پر یہ پہل کوشش ہے تو غلط نہ ہوگا۔ہاں اسے کتاب کہنے میں تامل ہوسکتا ہے کیوں کہ یہ بہت مختصر کل چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔گویا ایک رسالہ یا کتابچہ ہے۔ان کا فارسی کا ذوق بہت شستہ اور شگفتہ تھا

اقبال کی ایک غزل کے اردو ترجمہ کا اعلان ہوا۔کئی شاعروں نے ترجمے کی کوشش کی۔اقبال کی بہت خوب صورت غزل کا متن حسب ذیل ہے۔یہ غزل زبور عجم میں موجود ہے۔

خود را کنم سجودے دیر وحرم نماندہ ایں در عرب نماندہ آں در عجم نماندہ

در برگِ لالہ وگل آں رنگ ونم نماندہ درنالہ ہائے مرغاں آں زیر وبم نماندہ

درکاہ گاہِ گیتی نقش نوی نہ بینم شاید کہ نقشِ دیگر اندر عدم نماندہ

سیارہ ہائے گردوں بے ذوق انقلابے شاید کہ روز وشب را توفیق رم نماندہ

بے منزل آرمیدند پا از طلب کشیدند شاید کہ خاکیاں را درسینہ دم نماندہ

یادر بیاضِ امکاں یک برگِ سادۂ نیست
یا خامۂ قضا را تابِ رقم نماند

محمد کامل بی۔اے نے بھی اس غزل کا ترجمہ کیا اور یہ غزل رسالہ پیغامِ حق لاہور اقبال نمبر ۱۹۴۶ جلد ۱۲، عدد ۱۔۲۔۳ میں شائع ہوئی۔اس پر مدیر سید شاہ محمد کا ایک نوٹ بھی موجود ہے۔نقل پیشِ نظر ہے۔

دو آتشہ

ذیل کی فارسی غزل زبورِ عجم میں علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ارشاد فرمائی تھی۔سوزِ بیان اور دردِ دل کا اس سے اچھا نمونہ کوئی کیا پیش کرے گا۔ہمارے متعدد شعراء نے اس غزل کو ارد و کا جامہ پہنایا ہے۔ان تراجم میں سے ہم ذیل میں دو ترجمے شائع کر رہے ہیں۔ جو ہمارے دو محترم دوستوں (جناب کامل جونپوری اور مولوی غلام مصطفیٰ وکیل) نے پیغام حق کی اس خاص اشاعت کے لیے لکھے تھے۔

میں خود کو پوجتا ہوں اندر حرم نہیں کچھ اندر عرب نہیں کچھ اندر عجم نہیں کچھ
گلشن کے پھول پودے سب رنگ و بُو سے عاری بلبل کے چہچہوں میں اب زیر و بم نہیں کچھ
آتا نہیں نظر اب کوئی بھی نقشِ تازہ شاید کہ اور باقی اندر عدم نہیں کچھ
افلاک کے ستارے ذوق عمل سے خالی گویا کہ روز و شب میں توفیق رم نہیں کچھ
کوئی لگن نہیں ہے کوئی تڑپ نہیں ہے جیسے کہ آدمی کے سینے میں دم نہیں کچھ
لکھنے کو یا نہیں اب سادہ ورق جہاں میں یا خامۂ قضا میں تاب رقم نہیں کچھ

اقبال سے متعلق ان کی دوسری تحریریں دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکیں۔ حالاں کہ برق رسالہ کی سرپرستی میں شائع ہوتا رہا اور پریس بھی کام کرتا رہا۔ بزرگوں نے

اقبال فہمی کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ بڑا بابرکت تھا۔ کیوں کہ وہ پرخلوص جذبۂ احترام کے خمیر سے تیار ہوا تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ ہر دور میں تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ مولانا عمادی اور رشید احمد صدیقی کی قائم کردہ روایت کسی نہ کسی صورت میں کسی وقفے کے بغیر رودرواں کی طرح گامزن ہے۔ مطالعہ وتخلیق کا سرچشمہ جاری ہے۔ عصر حاضر میں کئی تخلیق کاروں نے اقبال کو مختلف طور پر گلہائے عقیدت پیش کیے ہیں۔ اس قبیلۂ قلم سے رہبر جون پوری کی نسبت قابلِ ذکر ہے۔ یہ جون پور کے موضع جے گہاں کے رہنے والے ہیں تعلیم وملازمت کے سبب زندگی کا بڑا حصہ بھوپال میں گزرا یہ اردو میں ادبِ لطیف پر تحقیق کرنے والے ڈاکٹر عبدالودود کے عزیز ہیں۔ رہبر جون پوری کی نظم ونثر میں تصانیف ہیں۔ آوارۂ زنجیر، موجِ سراب، متاعِ فکر، رقص قلم ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اور متاعِ فکر کی ۲۰۰۶ء میں اشاعت ہوئی۔ ان کی نظم 'آوارۂ زنجیر' بہت پسند کی گئی۔ یہ اٹھارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند کا آخری مصرع علامہ اقبال کی نظم شکوہ کے مصرع کی تضمین ہے۔ یہ نظم ایک دل آزار تقریر سے متاثر ہوکر رقم کی گئی آزادی کے بعد اردو معاشرے کو جس تنگ نظری اور منافرت کے ساتھ سابقہ ہے ان محسوسات پر یہ نظم قلم بند کی گئی ہے۔ پہلا اور آخری بند ملاحظہ ہو۔

ہم ہیں ہندی ہمیں اس بات سے انکار نہیں
ہم وطن دوست ہیں غیروں کے طرف دار نہیں
ہم ہیں منزل کے نشاں راہ کی دیوار نہیں
ہم وفا دار ہیں اس دیس کے غدار نہیں
ہم کوئی فتنہ گر دغاصب واغیار نہیں
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

ہم نے دیکھے ہیں بدلتے ہوئے حالات یہاں
ہم نے دیکھے ہیں سسکتے ہوئے جذبات یہاں
ہم نے دیکھے ہیں قیامت کے فسادات یہاں
ہم نے جلتے ہوئے دیکھے ہیں مکانات یہاں
زندگی کوئی ہم پہ گراں بار نہیں
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

اس نظم کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ رہبر کو اقبال کی رہ گزر عزیز تر ہے ۔انھیں بیانیہ اسالیب پسند ہیں اور اس پر انھیں مہارت بھی حاصل ہے مزید براں وہ ملی واسلامی فکر کے اقدار واسالیب زندگی کے قدردان ہیں۔ان کے محسوسات انھیں جذبات سے منور ہیں۔ان کی ایک دوسری نظم بھی توجہ طلب ہے۔ان کا چھٹا شعری مجموعہ 'ضربِ احساس' ہے۔اس میں اقبال کی غزلون پر چہار بیست بھی شامل ہیں۔یہ مجموعہ ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔اس میں اقبال کی مشہور غزل کو چھ بندوں میں تضمین کی صورت دی گئی ہے۔جو بہرصورت کام یاب بھی ہے۔یہ مرکزِ اقبال کے طرحی مشاعرہ ستمبر ۲۰۰۵ء کی یادگار ہے۔ ابتدائی دو بند ملاحظہ ہوں۔

مکانِ الامکاں کیا ہے صدائے بے صدا کیا ہے
نظامِ بزمِ کُن میں عقدۂ مرگ و بقا کیا ہے
خدا جانے کی تخلیقِ جہاں کا مدّعا کیا ہے
خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا ء کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے
حقیقت آشنا ہو خواب کی تعبیر سے پہلے

مآلِ زیست رکھ پیشِ نظر تدبیر سے پہلے
عیاں کر دل کی وسعت خواہشِ توقیر سے پہلے
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس تفصیلی تذکرے اور شعری حوالوں سے ثابت ہو رہا ہے کہ رہبر نے اقبال شناسی سے گزر کر اقبال پرستی کا حق ادا کیا ہے۔ جس میں ان کی مخلصانہ نیاز مندی اور عقیدت و محبت کا پیمانِ وفا بھی شامل ہے۔ ان اقرار و اعتراف میں حسنِ فن کے ساتھ قلب و نظر کے افکار کا سیلِ رواں موجزن ہے۔ جس کی مثال شفیق و عزیز کے یہاں مثلِ شعاعِ آفتاب روشن ہیں۔ یہ خاکِ جون پور کے ذرّوں کی مہر تاب درخشانی ہے جو شیرازِ ہند کے قلم کاروں کی روشنائی میں گردشِ لہو بن کر رواں ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے نذرِ بھوپال کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ جو ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی ہے اس مجموعہ میں رہبر کی صنعت توشیح کی صورت میں دس اشعار کی ایک نظم ہے جس کے چند اشعار حوالہ کے طور پر پیشِ نظر ہیں۔

عبور دریائے علم کر کے سراغِ ہستی کا جس نے پایا
خرد کو جس نے جنوں بنایا، جنوں کو جس نے خرد بنایا
ادائے سوز و گداز جس کی حیات کا ایک فلسفہ تھا
شعور و فکر و نظر میں جس کی مقامِ انسانیت جدا تھا
ہے آج تک نقشِ ہائے اقبال سے منور ریاض منزل
کلام سے جس کے ہو رہا ہے جدید ذہنوں کو فیض حاصل

رہبر جون پوری کو شعری تخلیق میں فیض ربّی حاصل ہے وہ زود گو ہیں اور بسیار

نویس بھی۔ 'رقص قلم' میں علامہ اقبال پر چھ بند والی ایک اور تضمین قابلِ ذکر ہے۔ بانگِ درا کی غزل پر تضمین ہے۔

ترا جلوہ ہے کوہ ودشت میں ہر اک نظارے میں
نظر آتی ہے قدرت تیری دریا میں کنارے میں
ہے خلاقی کا تیری عکس ہر موج اور دھارے میں
چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہو یا چاند میں سورج میں تارے میں
خیالی کیوں بھلا تصویر ہو ذوقِ تکلم کی
نئے انداز میں تعمیر ہو ذوقِ تکلم کی
مجازی کس لیے تفسیر ہو ذوقِ تکلم کی
شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چھپا جاتا ہوں !اپنے دل کا مطلب استعارے میں
عجب انداز میرے عشق کو بخشا ہے وحشت نے
دکھایا مری آنکھوں کو یہ دن میری قسمت نے
کیا ہے مجھ کو رسوا درد ہائے دل کی لذت نے
مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

یہ جون پور کے چند ادیبوں کی خدمات کا تذکرہ ہے۔ جو تشنہ ہے اور نا تمام بھی ۔ابھی اقبال شناوری کی روشن رہ گزر میں بہت سے لولوئے لالہ کا ذکر باقی ہے۔ راقم ربِّ کریم سے مزید توفیق کے لیے دعا گو ہے۔

ضمیمہ
قرآن کریم کے نایاب قلمی اوراق

قرآن کریم صحفِ سماوی کی آخری تنزیل ہے جو بنی نوع انسان کی ہدایت کے واسطے صبحِ قیامت تک کافی ہے۔ جستہ جستہ نزول کے ساتھ اس کے حفظ وتلاوت کا نظام اور اہتمام بے مثال حکیمانہ عملی تدبیر تھی جو صحیفے کی حفاظت اور ترتیب وتدوین میں معاون ہوئی۔ صاحبِ نزولِ کتاب نے اصحاب کی ایک جماعت کو اس کام کے لیے مامور کیا تھا۔ وہ کمالِ احتیاط اور احترام کے ساتھ اس کتابِ نور کو جمع وقلم بند کرنے میں مشغول تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنی نگرانی میں اسے مرتب کر کے نوعِ بشر کو نذر کیا۔ خلفائے راشدین نے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس صحیفہ کی نقلیں فراہم کیں جس سے عوامی استفادے اور نقل وکتابت میں غیر معمولی ذوق پیدا ہوا۔ اصحابِ قلم نے نقلیں تیار کیں۔ اسلام کے فروغ کے ساتھ قرآن کے حفظ وقرأت میں ایک انقلابی رجحان پیدا ہوا۔ شروع میں چمڑا، جھلّی، کھجور کی ٹہنی کا چوڑا حصہ دبیز کپڑا، اونٹ کے کوہان کی چوڑی ہڈی وغیرہ استعمال کیے گئے۔ حدیث کی کتابت کے سلسلے میں مختلف اشیاء کا ذکر ملتا ہے جیسے رقاع، لخاف، کتف، عسیب، اذیم، اکناف، اضلاع وغیرہ۔

حروف اور آوازوں کی صحیح قرأت کے پیشِ نظر حضرت علیؓ کے شاگرد ابوالاسود دویلی نے قرآن میں اعراب کا اہتمام کیا۔ ان کی صورت نقطوں کی تھی۔ زبر کے لیے اوپر زیر کے لیے حرف کے نیچے پیش کے لیے بازو یا کنارے اور تنوین کے لیے دو نقطوں کا

اہتمام کیا گیا۔عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کی ایما سے نصر بن عاصم نے رنگوں کا استعمال شروع کیا۔منقوط کے لیے سیاہ اور اعراب کے لیے قرزمی رنگ کے نقطے لگائے گئے۔ کچھ ہی وقفے کے بعد عبدالرحمٰن خلیل بن احمد عروضی نے اعراب کی علامتیں ایجاد کیں۔جو قدرے تبدیلی کے ساتھ آج تک رائج ہیں۔خطِ کوفی نے خاص ترقی کی۔خلیفہ مامون الرشید کے عہد تک اس میں بارہ ذیلی خطوط شامل تھے۔جو نگارش اور آرائش کے مختلف انداز واسالیب پر مشتمل تھے اور حسبِ ضرورت زیرِ استعمال تھے ان کے چند نام اس طرح ہیں۔قلم الجلیل،قلم السجلات،قلم الدیباج،قلم الطّومار الکبیر،قلم الثلث،قلم الزنبور،قلم الحرم،قلم القصص،قلم الموامرات،قلم المفتح،قلم المرصع،قلم انساخ،غبار الحلیہ وغیرہ۔

تحریر وکتابت نے بہت جلد ایک فن کی حیثیت سے اتنی ترقی کی کہ نظم سلطنت کے لیے ایک مستقل شعبے کو تشکیل دی گئی۔جو دارالانشاء کے نام سے مشہور ہوا۔وراقی کا پورا فن وجود میں آیا۔اس پیشے کے بارے میں علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں ایک باب قائم کیا ہے۔ایک تہذیبی قوت جوئے رواں کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔فن کار تخلیقی توانائی لے کر منظر عام پر آرہے تھے۔ابن مقلہ (۳۲۸ھ) نے خط کوفی سے چھ دوسرے خطوط پیدا کیے۔

ابن مقلہ وضع کرد ایں شش خط از خط عرب　　ثلث وریحان ومحقق نسخ وتوقیع ورقاع
بعد ازاں تعلیق آں خط است کش اہل عجم　　ہفتمی خط دگر تعلیق کردند اختراع

یاقوت مستعصمی،عبداللہ صرفی،عبداللہ طباخ ہروی،شمس کاتب شیرازی،اس خط کے ممتاز ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ابن مقلہ کے وضع کردہ خطوط پچاس سال سے زیادہ کی زندگی حاصل نہ کر سکے البتہ خطِ نسخ نے دوام پایا۔ابن مقلہ کے بعد ابوالحسن علی بن ھلال ابن بواب نے خط نسخ کی تہذیب وتزئین کی۔کچھ ہی دنوں کے بعد یہ خط تہذیبی اقدار سے آراستہ ہوکر جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان بن گیا۔پیچ وخم کے ساتھ عظمت وجلال کے عنصر کی شمولیت نے خط نسخ کو عربی ذہن اور عربی قلم کا پرشکوہ پیکر بنا دیا۔کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کا کتابت شدہ قدیم ترین نسخہ حضرت زید بن ثابتؓ کا رقم کردہ ہے۔

انہیں کاتبِ وحی بھی کہا جاتا ہے۔انھیں کے نسخے کی مدد سے حضرت عثمان غنیؓ نے کئی نسخے تیار کرائے ۔جو مختلف شہروں میں محفوظ کیے گئے ۔مصحفِ عثمانی کا ایک نسخہ تاشقند کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔کہتے ہیں کہ شہادت کے وقت وہ اسی نسخے سے تلاوت میں مشغول تھے۔واللہ اعلم بالصواب۔یہ نسخہ خط کوفی میں لکھا گیا ہے۔راقم نے اس نسخے کی نقل نہیں دیکھی ہے۔اس لیے پیشِ نظر اوراق کے طرزِ کتابت سے تقابل ممکن نہ ہوسکا۔

کتابت وتحریر کے اسالیب میں زماں ومکاں کے اثرات بھی شامل ہوتے رہے ہیں۔سب سے پہلے آرامی خط کا آغاز ہوا۔یہ قوم ارم سے منسوب خط ہے جو شام کے مغربی ساحل پر آباد تھی۔جنھیں فینقی بھی کہتے ہیں۔یہ قبل از اسلام کا خط ہے مگر اس کے موجد اہلِ عرب ہی ہیں۔حروف ابجد کے موجد بھی یہی قوم ہے۔اہل ایران نے نسخ اور تعلیق کی مدد سے نستعلیق ایجاد کیا۔معاملاتِ زندگی میں دقت کی تنگی کے باعث خطِ شکستہ کا رواج ہوا۔عہد شاہِ جہاں میں خط شیفعا بھی اسی تقاضے کے تحت چلن میں آیا۔اندلس میں عربوں کے ساتھ خطِ کوفی متعارف ہوا۔اس میں مقامی رنگ وآہنگ بھی شامل ہوا۔پیش نظر مخطوطہ میں یہی اندلسی اندازِ خط نمایاں ہے جو خط کوفی کی ایک قسم ہے۔اسے اندلسی خط کہتے ہیں۔یہ خط چھٹی ساتویں صدی ہجری تک مروج تھا۔ناچیز نہیں کہہ سکتا کہ پیشِ نظر قرآن کریم کے قلمی اوراق اندلس میں رقم کیے گئے یا عرب میں۔اتنا یقینی ہے کہ یہ برصغیر میں نہیں لکھا گیا۔یہاں کی کتابت میں یہ اسلوبِ تحریر دیکھنے کو نہیں ملتا۔

خطِ کوفی کی نسبت نواحِ کوفہ سے ہے۔جہاں یہ خط مروج تھا۔مدینہ منورہ کی طرف دوسرا خط رائج تھا جس پر کوفی طرزِ کتابت غالب آیا۔وہ خط معدوم ہوگیا۔کوفی خط کے کچھ مخصوص امتیاز ہیں اس کی ایستادگی بہت نمایاں ہے۔گویا لمبائی اور موٹائی سے اس خط کا جلال نمایاں ہوتا ہے۔یہ پرشکوہ تحریر ہے جو ربِّ جلیل کی طرح خط کی جلالتِ شان کو بھی ظاہر کرتا ہے۔عرب ثقافت کی بھی یہ شناخت ہے جس میں جلال وجبروت کے عناصر ہیں۔جمال وزیبائی کے موثرات کم محسوس ہوتے ہیں۔کتابت میں حسن ولطافت کا عنصر ایران میں بغایت درجہ شامل ہوا۔اس خط میں چوڑائی کم سے کم ہے۔کشش بھی کم ہے۔

مدوّر صورتیں یعنی گولائی سے زیادہ سروکار نظر نہیں آتا۔خاص طور پر نوکِ پلک پر بھی توجہ نہیں ہے۔قلم تراشی میں موٹے یا چوڑے قط کو ترجیح حاصل ہے۔ان اوراق میں بھی ان نکات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ان اوراق میں ایک ہی قلم اور کاتب ہے۔جس نے پورے قرآن کو رقم کیا ہوگا۔ ہر صفحہ پر پندرہ سطریں ہیں۔سورتوں کے آغاز میں خاص قلم کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پیشِ نظر صفحہ پر سورۂ حج کا اختتام ہوتا ہے اور سورہ ہود کے آغاز کی آیت کریمہ کی پوری سطر کو امتیاز کے لیے رنگین بنا دیا گیا ہے۔ربِّ جلیل کا کرم ہے کہ ناچیز کے پاس اس گراں قدر مخطوطہ کے پانچ ورق محفوظ ہیں۔انہیں کا تعارف پیشِ نظر ہے۔

پیشِ نظر صفحے پر آیتِ سجدہ بھی ہے۔(امام شافعی کے نزدیک) آیتِ سجدہ کے لیے حاشیہ پر ایک خاص تکونی شکل بنائی گئی ہے۔جو لکیروں پر مشتمل ہے جب کہ رکوع کی علامت کے لیے حاشیہ پر گول دائرے کا اہتمام موجود ہے۔جو آج کی مروجہ علامتوں سے مختلف ہے۔آیت اختتام پر قدرے مدوّر علامت سے آیت کے ختم ہونے کو نشان زد کیا گیا ہے۔پیشِ نگاہ اوراق میں بھی قرزمی رنگ کے نشان موجود ہیں۔جو نقطوں کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔استنبول والے نسخے میں بھی حاشیہ پر دائرے موجود ہیں۔زیرِ نظر صفحہ پر دو طرح کی مہریں ہیں۔جن کی عبارت نہیں پڑھی جاسکی۔ پتہ نہیں حاشیہ کے علاوہ درمیانِ متن مہر کیوں لگائی گئی؟ حاشیہ اور متن کی مہریں ایک ہیں۔البتہ صفحہ کے اوپری حاشیہ پر ایک بہت ہی مختصر مہر ہے۔اسے بھی پڑھنے سے قاصر رہا۔کاغذ دبیز ہے جو اس کو صدیوں تک محفوظ رکھنے میں بہت معاون ثابت ہوا۔اس کا رنگ ہلکا بادامی ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ کاغذ سازی میں ریشہ دار اشیاء کا استعمال ہوا ہے۔روشنائی سیاہ ہے مگر بہت پختہ اور چمک دار ہے۔کاغذ کی طرح روشنائی کے کیمیائی اجزاء کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔مہر کی روشنائی بہت پختہ ہے اور بعد کے زمانے کا تیار کردہ ہے۔لگتا ہے کہ صرف نام کا ہی اندراج ہے تاریخ نہیں ہے۔

فرانس والے نسخے مرقومہ (۵۱۶ھ) میں بھی حاشیہ پر گول دائرے موجود ہیں۔ آیتوں کے درمیان بہت ہی مختصر گول دائرے رقم کیے گئے ہیں۔نقطوں کے لیے قرزمی

رنگ مستعمل ہے۔مشہد والے نسخے مرقومہ ۴۰۱ ھ میں بھی قرزمی رنگ اور سورتوں کے درمیان امتیاز کے لیے جلی اور قدرے رنگین تحریر کا اہتمام ہے۔گرچہ یہ نسخہ بہت صاف اور پڑھنے میں نسبتاً آسان ہے۔یہ ایرانی کوفی کی طرزِ کتابت کا مظہر ہے اسے ان اوراق سے بعد کی کتابت پر یقین کیا جا سکتا ہے کیوں کہ دونوں کا طرزِ تحریر مختلف ہے۔

قدیم کتابت پر مشتمل قرآن کریم کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود۔مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کا خیال ہے کہ یہ نسخہ ابن مقلہ متوفی ۳۲۸ ھ کا لکھا ہوا ہے۔خط و اندازِ کتابت کی عکسی تحریر کو دیکھ کر راقم کو یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے۔یہ عکس ماہ نامہ نظام کان پور کے قران نمبر مارچ اپریل ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔اس ذخیرے میں ہرن کی کھال پر لکھی ہوئی آیاتِ قرانی کی قدامت بھی مشتبہ ہے۔ایران کے معروف مخطوطہ شناس ڈاکٹر حسین متقی نے مصحف مبارک کے اس خط کو دیکھنے کے بعد کہا ہے کہ یہ مخطوطہ چوتھی صدی ہجری کے اواخر یا پانچویں صدی کے شروع کا مکتوبہ ہے۔موصوف کے اس بیان سے اس کی قدامت کی توثیق ہوتی ہے۔چھٹی صدی ہجری میں قرآن کی کتابت کے لیے خط کوفی کی جگہ نسخ کا عام رواج ہو گیا تھا۔ڈاکٹر حسین متقی نے یہ بھی بتایا کہ حدادی کی تفسیر معانی کتاب اللہ کے طرزِ کتابت سے یہ خط ملتا جلتا ہے۔یہ کتاب ۴۸۴ ھ میں رقم کی گئی۔یہ مخطوطہ استنبول کے میوزیم میں موجود ہے۔جس کا عکسی نقل تہران میں بھی محفوظ ہے۔میرا ذاتی تاثر ہے کہ استنبول کے مذکورہ نسخے کی کتابت سے زیرِ نظر مخطوطہ کی کتابت کافی مختلف ہے اس کی کتابت میں خط کوفی کا ابتدائی اسلوب نمایاں ہے۔مشہد میں موجود مخطوطہ مرقومہ ۴۰۱ ھ کا خط اس سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔غالباً ایران کا قلم و خط کا اثر ہے کہ کوفی خط میں مقامی اسلوب بھی شامل ہو گیا ہے دنیا کے مختلف ذخیروں میں محفوظ دوسرے قدیم نسخوں کا مطالعہ جاری ہے۔شاید دیگر نسخوں سے تقابل کی توفیق کی سعادت حاصل ہو سکے۔جو بھی ہوا اتنا تو یقینی ہے کہ یہ مصحفِ قرآن کے بیش قیمتی اوراق بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔قرآن کریم کی تقدیس و تحریم کے ساتھ اس کے طرز کتابت کا مطالعہ بھی علم و دانش کی دریابی کا ناگزیر حصہ ہے۔

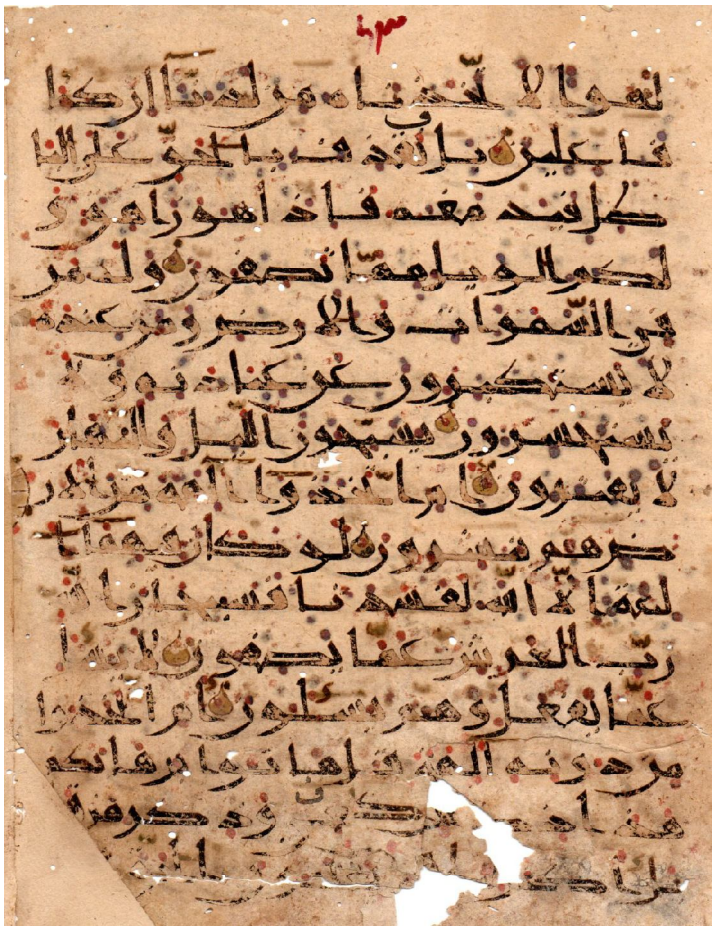

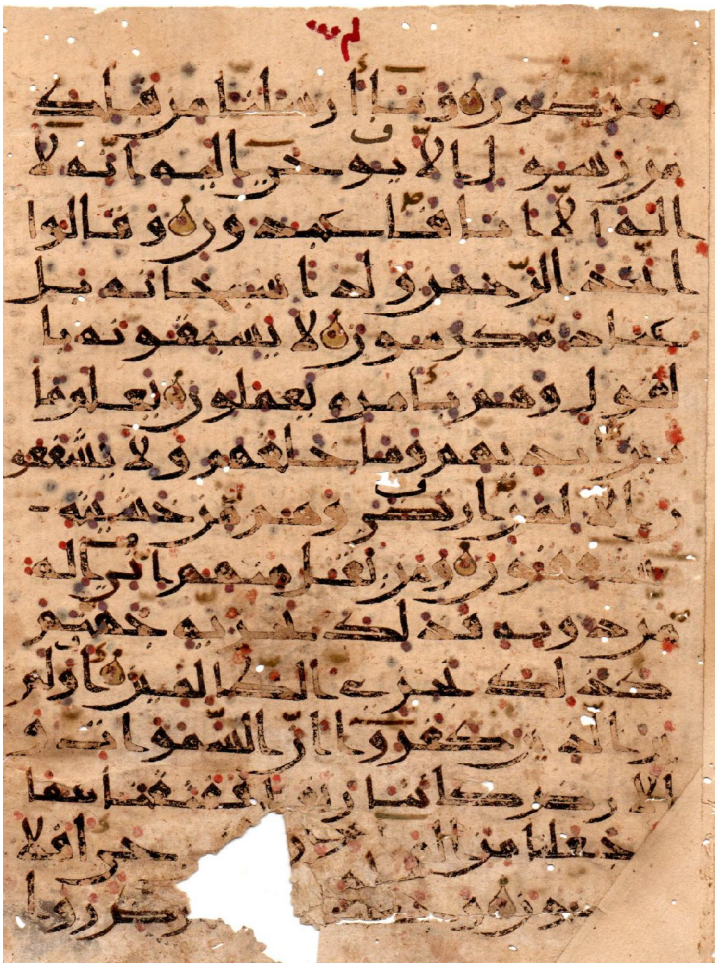

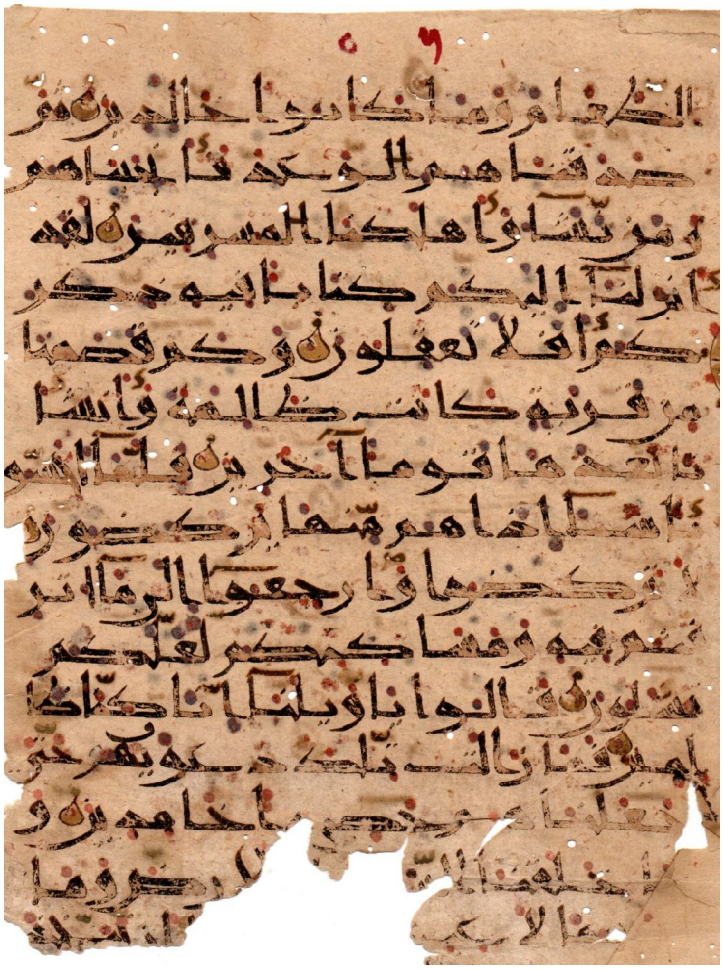

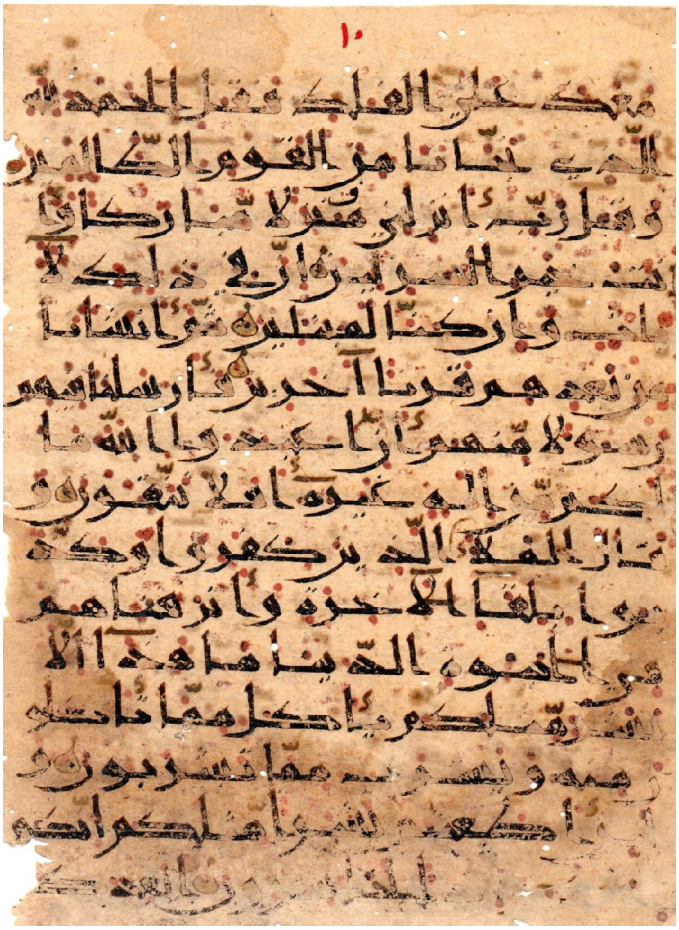

پروفیسر عبدالحق کی اقبالیاتی کتابیں

۱۔ اقبال کے ابتدائی افکار ۱۹۶۹ء
۲۔ تنقیدِ اقبال ۱۹۷۶ء
۳۔ فکرِ اقبال کی سرگزشت ۱۹۸۹ء
۴۔ اقبال اور اقبالیات ۲۰۰۶ء
۵۔ اقبال شاعرِ رنگیں نوا ۲۰۰۹ء
۶۔ اقبال کا حرفِ شریں ۲۰۱۵ء
۷۔ اقبال اور آرزوئے انقلاب ۲۰۲۱ء
۸۔ اقبال کی فکری سرگزشت ۲۰۱۹ء
۹۔ اقبال کے دینی تصورات ۲۰۲۳ء
۱۰۔ اقبال جہاں دوست ۲۰۲۴ء
۱۱۔ جون پور: شاہ راہِ اقبال شناسی کا سنگِ نشاں ۲۰۲۴ء (زیرِ اشاعت)
۱۲۔ سارے جہاں سے اچھا ۲۰۰۹ئ (مونوگراف) نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی
۱۳۔ محمد اقبال (مونوگراف) ۲۰۱۵ئ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کول کتہ
۱۴۔ علامہ اقبال (مونوگراف) ۲۰۱۶ئ دہلی اردو اکیڈمی، دہلی
۱۵۔ اقبال کے شعری اسالیب (ترتیب) ۱۹۸۹ء
۱۶۔ اقبال کی شعری و فکری جہات (ترتیب) ۱۹۹۷ئ
۱۷۔ نذرِ مشتاق (ترتیب) ۲۰۲۰ء
۱۸۔ بکھرے خیالات ۱۹۸۸ئ (Stray Reflection) (ترجمہ اقبال کی ڈائری)

AZRA BOOK TRADERS
E-185, Abul Fazal Enclave, Part 2
Shaheen Bagh, Okhla, New Delhi-25
Mob. No. +91 8882627658